آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جون 2024

www.urducouncil.nic.in

قیمت : -/10 ₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی
میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اردھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 8 شمارہ: 6 جون 2024

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages **64**

- قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل	مدیر	4

شخصیت

زینت ساجدہ: بحیثیت انشائیہ نگار	محمد نور احمد نور	5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار		9

جہان نسواں

نگار عظیم کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر سرفراز جاوید	10
امن کے فروغ میں خواتین کا کردار	ڈاکٹر ترنم خاں	14
آگ کے پاس بیٹھی عورت کا حاشیائی تجزیہ	عصمت رحمان	18
غزال ضیغم کے افسانوں میں تانیثی شعور	رقیہ مقصود	22
سرزمین بنگالہ کا ایک اہم تاریخی ناول 'تماشائے اہل کرم'	شگفتہ جہاں	26
کرشن چندر کے افسانے	شاہدہ کوثر	31
صادقہ نواب سحر کی ڈرامہ نگاری: مختصر جائزہ	ڈاکٹر خالد محمود	35
مولانا ابوالکلام آزاد: ہمہ جہت شخصیت	شبینہ اختر	39
شوکت کیفی بحیثیت خودنوشت نگار 'یاد کی رہ گزر' کے آئینے میں	مبینہ	43

حسن سخن

فرحانہ نازنین، زبیدہ شکیل		47

افسانہ

لوگ کیا کہیں گے	سیدہ ایمن عبدالستار	49
چھل قدمی	انصاری شاہین عبدالحکیم	52
نذرانہ وفا کا	نیلوفر سعدیہ	55

صحت

معدے کا درد	ابوسعدی خالد جاوید	59

مشعل

صحت قدرت کی طرف سے عطا کی گئی انسانی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہوتی ہے۔ صحتمند رہنے کے لیے اردگرد کا ماحول اہم رول ادا کرتا ہے۔ بہتر غذا لینے سے بھی صحت پر بہت اچھا اثر ہوتا ہے اور انسان ہمیشہ چاق و چوبند رہتا ہے۔ لیکن اس وقت ہم ماحولیاتی بحران کا شکار ہیں۔ ہمارا ا یکوسسٹم ماحولیات سے متعلق بہت سے خطرات کی زد میں ہے۔ ایکوسسٹم پر ہی تمام نظام کا دارو مدار منحصر کرتا ہے لیکن اب ماحول میں کثافت پیدا ہو چکی ہے۔ موسمی تبدیلیاں، زمین کے بڑھتے درجۂ حرات، بارشوں میں کمی وجہ سے خشک سالی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آلودگی نے انسانوں کی زندگی پر منفی اثر ڈالا ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں سائنس نے بہت ترقی کی ہے۔ روز بروز انسانوں کے طرز زندگی میں تبدیلی آ رہی ہے اور ہم ماحولیاتی تبدیلیوں سے دوچار ہو رہے ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی پیدا کرنے والے ذرائع میں جنگلات کا کٹاؤ، شہروں کا بے جا پھیلاؤ اور ادویات کا کثرت سے استعمال ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کے نتائج منفی انداز میں گلوبل وارمنگ کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ جس کے سبب بہت سی بیماریاں پیدا ہوئی ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی کے اثرات سے انسانی زندگی بری طرح متاثر ہوئی ہے اور مختلف بیماریوں سے انسانی زندگی پر برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی ایک خطرہ بن کر ابھرا ہے۔ تمام ممالک اس کی زد میں ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی سے صرف انسان ہی نہیں بلکہ دیگر انواع حیات پر بھی منفی اثر پڑا ہے۔ ہم نے قدرت کے اصولوں اور قوانین کو مثبت انداز کے بجائے منفی انداز میں لیا ہے۔ ہمیں اپنے طور طریقوں کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے۔ کسی بھی چیز کی زیادتی ہمیشہ منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ ہمیں منفی سوچ سے اوپر اٹھ کر کام کرنا ہوگا اور ایسا ماحول آنے والی نسل کو فراہم کرنا ہوگا جو ان کے لیے فائدہ مند ہو۔ ان کی صحت پر اچھا اثر ڈالے اور وہ مثبت سوچ سکیں۔ ہمیں اپنے اطراف کے ماحول کو صاف و شفاف رکھنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیڑ لگانے ہوں گے اور صفائی کا خاص اہتمام کرنا ہوگا۔ کثافت سے پاک ماحول میں بچوں کی پرورش کی جائے گی تو بچوں کی زندگی میں اس کے مثبت اثرات پڑیں گے۔ ہمیں اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے اور اس میں بہتری لانے کی کوشش اپنے گھروں سے ہی شروع کرنی ہوگی۔

ماحولیاتی آلودگی ایک مسئلہ بن کر ابھرا ہے۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔ ماحولیاتی آلودگی سے بچنے کے لیے ایسے اقدام کرنے ہوں گے جن کے دور رس نتائج برآمد ہو سکیں۔ صنعتوں میں پائیدار طریقے اپنائے جائیں تو ماحولیاتی آلودگی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ خواتین مختلف مہم کے ذریعے ماحولیات کے تئیں بیداری لا سکتی ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی کو ختم کرنے کے لیے ہر شخص کو اپنی ذمہ داری نبھانی ہوں گی تاکہ آنے والی نسلوں کو صاف ستھرا ماحول مل سکے۔

آپ کا

محمد نور احمد نور

زینت ساجدہ بحیثیت انشائیہ نگار

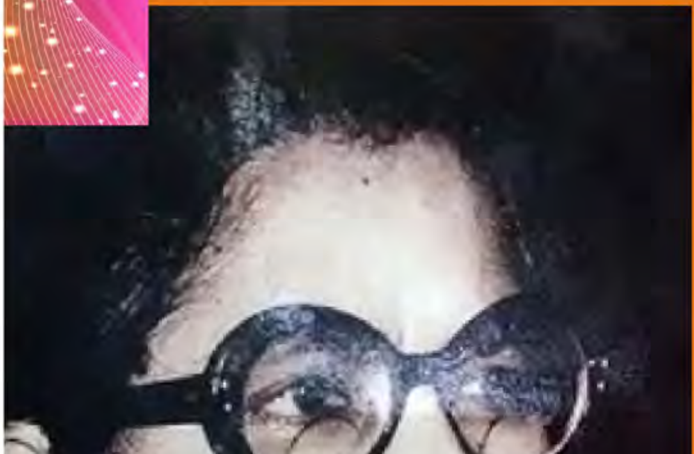

ڈاکٹر زینت ساجدہ 28 مئی 1924 کو کرناٹک کے رائچور میں پیدا ہوئیں۔ ان کا اصل نام زینت النساء ساجدہ بانو ہے لیکن ادبی دنیا میں زینت ساجدہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب صوفیائے دکن سید رسول القادری سبز پوش اور مصنف مثنوی من لگن قاضی محمود بحری سے ملتا ہے۔

زینت ساجدہ نے عثمانیہ یونی ورسٹی سے دکنی کے اولین دور کے شاعر اشرف بیابانی کی مثنوی ''نوسر ہار'' پر پروفیسر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کی نگرانی میں اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا اور 1973 میں ڈاکٹریٹ کے ڈگری سے سرفراز ہوئیں۔

زینت ساجدہ حیدر آباد کی خواتین ادیبوں میں ایک منفرد پہچان رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ افسانے کے علاوہ خاکہ، مزاحیہ مضامین، تحقیق وتنقید اور انشائیے لکھ کر اردو زبان وادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا لیکن ادبی دنیا میں وہ بہ حیثیت افسانہ نگار اور انشائیہ نگار مقبول ہوئیں۔

ان کا پہلا انشائیہ "اگر میں مرد ہوتی" 1945 میں شائع ہوا۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''اسلوب بیاں اور" کے نام سے 2019 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں کل 17 انشائیے ہیں۔ زینت ساجدہ کے انشائیوں کی زبان سلیس اور سادہ ہے۔ وہ محاورات کا برمحل استعمال اور بات سے بات بڑی آسانی سے پیدا کرتی ہیں۔

انشائیے کا فن دریا کو کوزے میں سمونے کا نام ہے، انشائیہ مختصر ہوتا ہے۔ تخلیق کار انشائیہ میں زندگی کی کتاب یعنی اپنے تجربات ومشاہدات کو

بڑی فن کاری سے اختصار کے ساتھ سموتا ہے۔ انشائیے کے لیے کوئی باقاعدہ اصول نہیں ہیں، وزیر آغا کا خیال ہے کہ:

"انشائیہ نثر کی دوسری اصناف سے اپنے اختصار کے باعث علاحدہ نظر آتا ہے۔ سانیٹ کی طرح انشائیہ کا بھی ایک مختصر سا میدان ہے جس کے اندر انشائیہ لکھنے والا آپ کو تصویر کا ایک مخصوص رخ دکھاتا ہے"

(وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، لبرٹی آرٹ پریس، دہلی 1991، ص 12)

درج بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کا ہونا انشائیہ کے لیے ضروری ہے جس طرح شاعری میں بڑی سے بڑی باتوں کو چند لفظوں کے دھاگے میں پرویا جاتا ہے، شعر کا ہر مصرع شاعر کے شعور و تصور کے کئی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح انشائیہ کے مختصر جملے اپنے اندر بہت وسعت رکھتے ہیں جو قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ وہ انشائیہ کی ان فنی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے انشائیوں کو دل چسپ بنانے کی پوری کوشش کرتی ہیں۔ وہ انشائیے کو اختصار سے پیش کرنے کے ہنر سے خوب واقف ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے، موضوع پر بے باکانہ اظہار خیال اور اس کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔ اختصار کے ساتھ جامعیت ان کے انشائیوں میں بجا طور پر نظر آتی ہے۔ انشائیہ "مکان بناڈالا" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"باورچی خانے میں ساری عصری سہولیتیں موجود رہیں تاکہ نوکر نہ ہو تو ہم خود آسانی سے پکوان کرلیں، چھوٹا سا دالان مفلسی کی نشانی ہے، بڑا دالان بنائیں گے دعوتوں کی سہولیت رہے گی، نیچی چھتوں سے ہمارا دم گھٹتا ہے، چھتیں اونچی ہونی چاہیے۔ اندر کے آنگن میں آم اور نیم کے گھنے پیڑ ہوں گے تو گرمی میں سایہ رہتا ہے۔"

(مکان بناڈالا، اسلوب بیاں اور، اردو مجلس حیدرآباد 2009، ص: 44)

اس کے علاوہ اختصار کی مثالیں ان کے دیگر انشائیوں میں بھی جابجا ملتی ہیں۔ انشائیہ "میں نے نوکری کی، دیکھا دیکھی، کباڑ خانے سے میوزیم تک" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

انشائیہ کی ایک خوبی اس کا غیر رسمی انداز ہے یعنی انشائیہ نگار اپنے اسلوب کی بدولت ایسے طریق کار اختیار کرتے ہیں کہ قاری کو اپنے اعتماد میں لے لیں۔ غیر رسمی طریق کار اختیار کرتے وقت انشائیہ نگار یا تو اسلوب میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اصل موضوع سے ہٹ کر دوسرے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جس سے تحریر میں بے رنگی یا بے ترتیبی پیدا ہوتی ہے لیکن یہ بے ترتیبی قاری کے ذہن پر گراں نہیں گزرتی۔

انشائیہ کے لیے موضوع کا انتخاب کرنا ایک مشکل عمل ہے۔ کیوں کہ انشائیہ نگار کسی موضوع کا پابند نہیں ہوتا بلکہ انشائیہ میں منتخب موضوع کا سہارا لے کر زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے اور ایسا غیر معمولی زاویہ تلاش کیا جاتا ہے۔ جسے پڑھنے والے کو غور و فکر کی نئی راہ مل سکے۔ انشائیہ نگار معاشرے کی تمام سرگرمیوں کو اپنی نظروں کے سامنے رکھتا ہے اور اس کی تمام حرکات کو بڑے ہی لطیف اور شگفتہ انداز میں اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ اس طرح انشائیہ نگار کی تحریر میں جو عکس ابھرتا ہے اس میں زمانے کی سرگرمیاں، ذات کا کرب موجود ہوتا ہے۔ زینت ساجدہ کے انشائیہ میں بھی سماجی، سیاسی، معاشرتی و مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی پہلو نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر انشائیہ "اگر میں مرد ہوتی" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انشائیہ نگار نے تانیثیت کے تصور کے ساتھ ساتھ عورتوں کے جذبات کو بڑی ہی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"جب مرد اور عوت دونوں ہی خدا کی مخلوق ہیں جب دونوں ہی مل کر اس دنیا کے خرابے کو آباد کرتے ہیں تو پھر زندگی ایک کے لیے محدود اور دوسرے کے لیے لامحدود کیوں؟ ازل سے عورت یہی سوال کرتی آئی ہے اور کرتی رہے گی کبھی ہنس کر کبھی رو کر۔"

(اگر میں مرد ہوتی، اسلوب بیاں اور، اردو مجلس، حیدرآباد، 2009 ص 88)

مندرجہ بالا اقتباس میں تانیثیت کی جھلک نظر آتی ہے جس میں انشائیہ نگار نے عورتوں کے جذبات کو پیش کیا ہے جو سماج کے ہر طبقے کے لئے مساوی حقوق کی سفارش کرتی نظر آرہی ہے۔ مذکورہ سطور کو پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن مساوی حقوق پر غور و فکر کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے اور یہ انشائیہ کی ایک صفت ہے۔ جو زینت ساجدہ کے انشائیہ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

انشائیہ میں انشائیہ نگار موضوع کے حوالے سے اپنے احساسات و جذبات کو اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے۔ یعنی انشائیہ نگار کا ذاتی مشاہدہ کائنات کے مشاہدے کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ زینت ساجدہ کا ہر انشائیہ احساسات و جذبات سے پوری طرح مزین نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی شخصیت کا سہارا لے کر اپنے احساس و جذبات کو اپنے انشائیوں میں جگہ دی ہے۔ زینت ساجدہ نے اپنے انشائیوں کے لیے ہر طرح کے موضوعات کا انتخاب کر کے عام سے

عام اور چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو بھی انشائیے کا موضوع بنایا ہے۔ جوان کے ایک بہترین انشائیہ نگار ہونے کی دلیل ہے۔ انشائیہ کی زبان و بیان پر اگر نظر ڈالیں تو یہ ادب کی دیگر اصناف سے اس کی بنیاد پر منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ انشائیہ کی زبان بلند سطح کی حامل ہوتی ہے۔ اس میں شوخی اور سنجیدگی، تفکر اور تخیل، ایجاز واختصار اور وضاحت، فلسفیانہ انداز فکر اور شاعرانہ احساس یہ تمام مختلف عناصر موجود ہوتے ہیں۔ انھیں عناصر کی بنا پر انشائیہ کی زبان اپنے اندر انفرادیت رکھتی ہے۔ یعنی انشائیہ میں شوخی و شگفتگی اور بے تکلف گفتگو کا انداز پایا جاتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیے زبان و بیان کی سطح پر فنکاری اور تخلیقیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی زبان میں شوخی و سنجیدگی، تفکر، تخیل، ایجاز و اختصار، غرض تمام خصوصیات موجود ہیں۔ زینت ساجدہ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں حسب ضرورت محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال کیا ہے۔ بہت ساری سطروں میں ضرب الامثال کے استعمال سے بھی انشائیوں کو زینت عطا کی ہے۔ ان کے انشائیوں میں تشبیہات واستعارات، ضرب الامثال، محاورے کا برمحل اور خوبصورت استعمال دلکشی اور لطافت پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انشائیہ ''بی جمالو" کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"سچ مچ یہ نہ ہوں تو دنیا کے کام ادھورے، غیر دل چسپ اور بے رنگ رہ جائیں اور اس کے خون سے اُس کے ہاتھ رنگنا، اس کے گھی سے اُس کے روٹی چیرنا، اس کی ٹوپی اس کے سر پر رکھنا یہ سب کام ہے لیکن خود آپ بیدماغ ہیں ہر ایک کے کام آتی ہیں پھر ان کو برا کون کہے۔" (بی جمالو، اسلوب بیاں اور، اردو مجلس، حیدر آباد2009،ص:36)

مذکورہ بالا اقتباس میں تین محاورے'' اس کے خون سے اُس کے ہاتھ رنگنا، اس کے گھی سے اس کی روٹی چیرنا اور اس کی ٹوپی اس کے سر رکھنا'' جس حسن وخوبی کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں وہ عین فطری معلوم ہوتے ہیں اور اس کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ انشائیہ بھلے ہی مضمون نگاری کی ہی ایک شکل ہے لیکن ادب میں یہ ایک صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ انشائیہ میں طنز ومزاح کی شمولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں طنز ومزاح کو معتدل مقدار میں ایک معاون قوت کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔

زینت ساجدہ کے انشائیوں میں جگہ جگہ طنز ومزاح نظر آتا ہے۔ انھوں نے جارحانہ اور شدید قسم کے طنز ومزاح سے پرہیز کیا ہے۔ ہلکے پھلکے طنز ومزاح کا سہارا لیتے ہوئے اپنے اسلوب کو انفرادیت عطا کی ہے۔ انھوں نے طنز ومزاح کو بے تکلف اور دوستانہ فضا میں اپنایا ہے جس کی بدولت وہ قاری کو اپنا شریک بنا لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر انشائیہ "اگر میں مرد ہوتی" میں انشائیہ نگار خود کو بطور ایک مرد تسلیم کرتے ہوئے مردوں کے کردار اور رجحانات پر طنز کے تیر چلائے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اگر قسمت ساتھ دیتی اور کچھ بن جاتا تو پچھلے دنوں کو یکسر بھول کر غریبوں کا خون چوستا، رشوت کا بازار گرم کرتا اور ایسی بیوی چاہتا جو بڑے باپ کی بیٹی ہوں، خوبصورت ہو اور پڑھی لکھی ہوں، سوسائٹی میں شریک بن سکے اور ساتھ ہی ایک اونچے مکان، بڑھیا کار اور چالیس ہزار نقد بھی جہیز لا سکے اور اگر ضرورت پڑے تو اپنے باپ کے اثر ورسوخ سے کام لے کر مجھے اونچا عہدہ دلا سکے۔"

(اگر میں مرد ہوتی، اسلوب بیاں اور، اردو مجلس، حیدر آباد2009،ص:87)

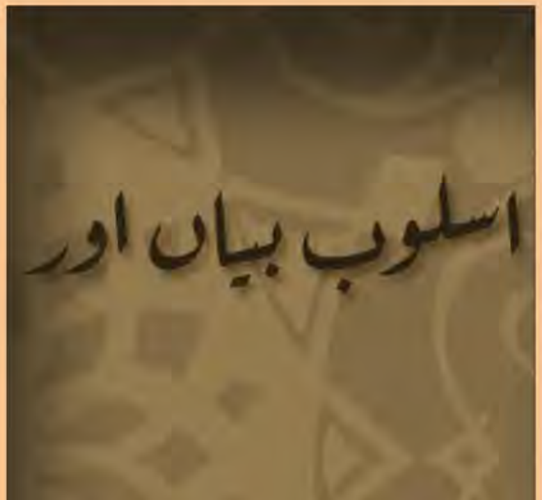

انشائیہ کی فنی صفات میں عدم تکمیل کے احساس کو فن انشائیہ کا ایک

اہم عنصر تسلیم کیا جاتا ہے۔ انشائیے نگار کو انشائیہ ایسے مقام پر ختم کرنا ہوتا ہے کہ قاری کو اس کے نامکمل ہونے کا احساس ہو اور قاری غور و فکر کرنے پر آمادہ ہو۔ زینت ساجدہ کے انشائیوں میں یہ صفت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان کے انشائیوں کے مطالعے کے بعد عدم تکمیل کا احساس ہوتا ہے اور انشائیہ کے اختتام پر قاری کو ایک نیا اور غیر رسمی زاویہ مل جاتا ہے جو اس کے ذہن کو غور و فکر کی طرف راغب کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انشائیہ ''اگر اللہ میاں عورت ہوتے" کا اقتباس ملاحظہ کریں:

" مگر سن لے تو چاہے کوئی ہو، کچھ نہ ہو، سب کچھ ہو، پھر بھی مجھے پیارا ہے۔ میری بے نام آرزوؤں سے زیادہ پیارا ہے تو عالم الغیب ہے، اس لیے جانتا ہے کہ گستاخی کیسی ہے۔ تجھی سے تیری باتیں کرتے ہیں اس لیے معاف کر دینا اللہ میاں، میں نے تو یوں ہی نہیں سوچا تھا اگر اللہ میاں عورت ہوتے تو۔۔۔"

(اگر اللہ میاں عورت ہوتے، اسلوب بیاں اور، اردو مجلس، حیدرآباد 2009، ص:25)

انشائیہ میں انکشاف ذات اور شخصی نقطہ نظر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ انکشاف ذات اور شخصی نقطہ نظر کو انشائیہ کی بنیادی اجزاء میں شمار کیا جاتا ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور ادیب بہ حیثیت ایک ترجمان، اسی طرح انشائیہ نگار بھی زندگی کے حقائق، مشاہدات، تجربات، احساسات وجذبات کو اپنی تحریر میں جگہ دیتا ہے۔ انشائیہ نگار ان باتوں کو غیر رسمی انداز اختیار کرتے ہوئے ہلکے پھلکے الفاظ، لطیف و شگفتہ اسلوب میں بیان کرتا ہے اور ان تمام چیزوں کو بیان کرنے میں انشائیہ نگار آزاد ہوتا ہے۔ شخصی نقطہ نظر کے حوالے سے ان کے ایک انشائیہ "اگر میں مرد ہوتی" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں وہ خود کو ایک مرد جا گر کرتی ہیں۔

"اماں کی ڈانٹ اور ابا کے جوتے ہمارا انتظار کرتے، چاندنی اور برسات کے موسم مجھے بہکانے کو کافی ہوتے لکھنے پڑھنے اور محنت کرنے سے جی چراتا گھر میں شکایت کرتا کہ شور و غل کے مارے پڑھنا نہیں ہوتا، اس لیے ہاسٹل میں رہنا چاہیے اور ہاسٹل میں رہ کر خوش ہوتا ہے کہ روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔ کبھی کبھار پڑھنے کا مظاہرہ کرتا، یوں کہ کتاب سامنے کھلی ہوئی ہے اور میں اس میں دوستوں سے لڑکیوں کے بارے میں معلومات آفریں تقریں کر رہا ہوں۔ یا انھیں کے بارے میں سوچ رہا ہوں بظاہر عورتوں کو برا بھلا کہتا مگر بند کمرے میں دھڑکتے دل اور الجھتے سانسوں رو کے عصمت کے افسانے پڑھتا۔"

(اگر میں مرد ہوتی، اسلوب بیاں اور، اردو مجلس، حیدرآباد، 2009، ص:86)

انشائیہ کے فن میں ایک اہم خصوصیت اسلوب کی شگفتگی ہے۔ انشائیہ نگار اسلوب کی شگفتگی کی بنا پر ہی قاری کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔ زینت ساجدہ کے انشائیہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے اسلوب، حسن اور شگفتگی کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ اپنی تحریر میں سادہ اور عام فہم اسلوب اختیار کرتے ہوئے عام اور غیر سنجیدہ باتوں کو بڑے ہی انوکھے انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے ایک انشائیہ " گنڈی پیٹ کا پانی" سے ایک اقتباس پیش ہے۔ جس میں انھوں نے گنڈی پیٹ کے پانی کی صفات کو بڑے ہی لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔

"لوگ کہتے ہیں کہ حیدرآباد کی ہوا میں بڑی تاثیر ہے، نہیں صاحب یہ بات نہیں، یہ اس گنڈی پیٹ کے پانی کا اثر ہے کہ اچھا خاصا چست چالاک سادہ میزاج، اعلا دماغ، شریف آدمی اس کے پیتے ہی خوش آمد پسند، رشوت خور، ست خرام اور اقربا نواز بن جاتا ہے۔ تو ندا نکل آتی ہے اور عقل پچک جاتی ہے۔"

(گنڈی پیٹ کا پانی، اسلوب بیاں اور، اردو مجلس، حیدرآباد 2009، ص:56,57)

زینت ساجدہ کے انشائیوں کے مطالعے سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے انوکھے انداز میں اپنے جذبات و احساسات اور تجربات و مشاہدات کی عکاسی کی ہے۔ زینت ساجدہ کے انشائیوں کی زبان بہت خوبصورت اور آسان ہے۔ شگفتہ بیانی ان کے انشائیوں کی اہم خوبی ہے۔ ان کی زبان میں روانی اور لہجے میں بے باکی ہے۔ انھوں نے تشبیہات و استعارات، محاوروں کے ذریعے اپنے انداز بیان کو مؤثر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

□□□

Md. Noor Ahmed Noor
Department of Urdu
Assam University
Silchar-788011 (Assam)
Mob: 8250992426
nazimnoor2@gmail.com

شاعرات کے منتخب اشعار

عشق دارومدار ہے اپنا
بے قراری قرار ہے اپنا

خاک میں مل گئی ہوں جس پر اسیر
ان کے دل میں غبار ہے اپنا

امیر بیگم اسیر دہلوی

آئے امراؤ دن ترے اچھے
دن بہ دن مفلسی جو گھٹتی ہے

غصہ سے چہرہ میرا گل نار ہو گیا
بس یار مجھ کو طعنۂ اغیار ہو گیا

امراؤ دہلوی

امراؤ کیا کہوں کہ شب ہجر تپش غم
چبھتا رہا ہر اک رگ جان میں آخر تک

گر مجھ کو سر کاکل خمدار نہ ہوتا
تو میں یوں بلاؤ میں گرفتار نہ ہوتا

امراؤ لکھنوی

چھوڑ کر مجھ کو کہاں اے بت گمراہ چلا
تو چلا کیا کہ دل بھی ترے ہمراہ چلا

چھٹ گیا غم سے مرا کشتۂ ابر مر کر
ایک چھری مرے گلے پر بھی مری آہ چلا

بنو دہلوی

نہ کیجیے ناز حسن عارضی پر
نہ سمجھو یہ بہار بے خزاں ہے

تری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے
گہے مضطر ہے، دل گاہے تپاں کا

بسم اللہ دہلوی

دل جس سے لگایا وہ ہوا دشمن
کچھ دل کا لگانا ہی ہمیں راس نہ آیا

نہیں ٹلتی کسی عنوان سر سے
شب غم بھی کوئی کالی بلا ہے

جانی بیگم

تصور اس صنم کا دل میں لائے جس کا جی چاہے
ہماری بات سن کر آزمائے جس کا جی چاہے

محبت کے محل میں عاشق جانباز رہتا ہے
نہیں خالہ کا گھر اس میں جو آئے جس کا جی چاہے

جعفری

روٹھنے کا عبث بہانہ تھا
مدعا تم کو یاں نہ آنا تھا

یہ کس کی آتش غم نے جگر جلایا ہے
کہ تا فلک مرے شعلہ نے سر اٹھایا ہے

جینا بیگم

(شاعرات کا تذکرہ، نسیمہ دہلوی، ناشر: نامعلوم تنظیم، ریختہ ویب سائٹ، سن اشاعت درج نہیں)

ڈاکٹر سرفراز جاوید

نگار عظیم کی افسانہ نگاری

اردو افسانہ کی عمر غالباً سوا سو سال پر محیط ہے۔ افسانوی ادب میں اس کی مقبولیت چند دہائیوں میں ہی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اردو افسانہ فن اور نفس مضمون کی اہمیت کے اعتبار سے بہت جلد ہی دیگر زبانوں کی کہانیوں کے معیار کے مدمقابل ہوگیا۔ اردو زبان وادب میں خواتین فکشن نگار بھی پیچھے نہیں رہیں۔ کیونکہ انھوں نے بھی دنیائے ادب کے مطالعہ کے ذریعے خواتین کے حقوق ومسائل کو خوب سمجھا۔ انھوں نے مزید اپنی تعلیمی لیاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے، معاشرے کے نسائی مسائل کا بڑے باریکی سے مطالعہ بھی کیا۔ جس کے باعث انھوں نے اپنے مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ کی رو سے خواتین کی سماجی اور خانگی زندگی کی پریشانیوں کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنا دیا۔ کیونکہ ان کو اپنے حقوق اور مسائل کا بھرپور ادراک واحساس ہو چکا تھا۔ وہ اردو ادب کی ترقی پسند اور غیر ترقی پسند تحریکات سے بھی وابستہ رہیں۔ ان قابل احترام ادیباؤں نے بڑی عمدہ اور لائق رشک تخلیقات پیش کی ہیں۔ ان کی نگارشات اسکول سے لے کر

جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔اردو فکشن کی معروف ادیبائیں ڈاکٹر رشید جہاں،حمیدہ سلطان،رضیہ سجاد ظہیر،صالحہ عابد حسین،عصمت چغتائی، ممتاز شیریں،شکیلہ اختر،قرۃ العین حیدر،خدیجہ مستور،بانو قدسیہ،ہاجرہ مسرور،جیلانی بانو،واجدہ تبسم،آمنہ ابوالحسن، سرلا دیوی، انور نزہت، صغریٰ مہدی،زاہدہ حنا،ترنم ریاض،ذکیہ مشہدی،ثروت خان،نعیمہ جعفری پاشا،شمع افروز زیدی ،نگار عظیم،رخشندہ روحی ، نشا زیدی،غزالہ قمر اعجاز۔۔۔وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر نگار عظیم کا اصل نام ملکہ مہر نگار ہے۔وہ دہلی کی معاصر معروف خواتین افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔وہ مغربی اتر پردیش کے تاریخی شہر میرٹھ میں 9ر ستمبر 1951 کو پیدا ہوئیں۔انھوں نے ایم اے (فائن آرٹس)اور اردو میں پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی ہے۔وہ غالباً چار دہائیوں سے افسانے لکھ رہی ہیں۔وہ بہت زیادہ بسیار نویس افسانہ نگار نہیں ہیں۔تاہم ان کے تین افسانوی مجموعے 'عکس'، 'گہن' اور 'عمارت' 'منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 'عکس' کی اشاعت 1990 میں، 'گہن' کی اشاعت جون 1999 میں، اور 'عمارت' کی اشاعت 2010 میں ہوئی۔ مجموعہ 'گہن' 15ر کہانیوں پر مشتمل ہے۔اس مجموعہ کے چند افسانوں کے عنوانات مندرج ہیں:فرض، سنگین جرم، گہن، کنفیشن، تکمیل، حصار وغیرہ۔

کنفیشن: نگار عظیم کا بڑا اہم افسانہ ہے۔یہ افسانہ سماج کے جنس پرست لوگوں کا عکاس ہے۔افسانہ نگار نے دلاور خاں کے کردار کے ذریعہ سماج کے بہت سے جنسی بدکرداروں کے معاملات کو بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔رقیہ اس افسانہ کی اہم اور مثالی کردار ہے۔افسانہ نگار نے رقیہ کے کردار کے ذریعہ معاشرے کی نوجوان لڑکیوں کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ اپنی عفت کی حفاظت حوصلہ مندی کے ساتھ کس طرح ممکن ہے۔افسانہ کی کہانی کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ رقیہ کے والد کے انتقال کے بعد دلاور خاں، جو اس کے ابو کا جگری دوست تھا۔ رقیہ اس کو تایہ کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔رقیہ کی امی اور دلاور خاں، باہمی رضامندی سے شیر وشکر ہو گئے۔حتیٰ کہ دونوں نے بچوں کی ملکیت پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا۔رقیہ ان سب حالات و معاملات کو مجبوراً برداشت کرتی رہی۔

رقیہ کی پھوپھی ایک دن غیر متوقع طور پر گھر آجاتی ہیں۔وہ اپنی بیوہ بھابی سے بیٹے مراد کے لیے رقیہ کا ہاتھ مانگتی ہیں۔مگر رقیہ کی امی بغیر کسی جواز کے رشتہ سے انکار کر دیتی ہے۔رقیہ کی پھوپھی اور بیٹا مراد، ان سے رشتے ناتے کی رسم وراہ بند کر لیتے ہیں۔وہ اسی سبب ان کی دہلیز پر قدم رکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔رقیہ کی امی کچھ دن بعد گھر میں غیر متوقع طور پر اپنا فیصلہ سناتی ہے کہ میں نے رقیہ کا رشتہ اس کے تاؤ کے لڑکے اچھن سے طے کر دیا ہے۔وہ اسی کے ساتھ دلاور خاں کی مالداری کی تعریف کرنے لگتی ہے۔اس موقع پر رقیہ کے منہ سے صرف اتنا نکلتا ہے، کہ امی میرے بغیر پوچھے۔رقیہ کی امی گویا ہوتی ہے کہ تو نہیں جانتی، ابھی تو بچی ہے۔گھر کی ملکہ بن کر تمام زندگی عیش کرے گی، کیوں کہ گھر پر کام کاج کرنے والے نوکر چاکر ہوں گے۔

مگر ایک روز رقیہ کو اس سے بھی بڑھ کر افسوسناک واقعہ پیش آتا ہے۔اس کی امی صبح سویرے ہی گھر سے دوپہر تک لوٹنے کا بہانہ بنا کر نکل جاتی ہے۔امی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد دلاور خاں گھر آتا ہے۔وہ لڑکی رقیہ سے معلوم کرتا ہے کہ تیری امی کہاں ہے؟رقیہ جواب دیتی ہے کہ وہ کسی کام سے باہر گئی ہیں، دوپہر تک واپس آئیں گی تو دلاور خاں اپنے منصوبہ کے مطابق اس سے گویا ہوتا ہے کہ میری جان تو، تو ہے۔رقیہ ان کا غیر متوقع جملہ سن کر ہکا بکا رہ جاتی ہے۔تاہم وہ ہمت کر کے ان کو بُرا بھلا کہتی ہے۔ مگر دلاور خاں پر تو جنسی ہوس کا شیطان سوار تھا۔وہ کہاں ماننے والا تھا۔وہ اس مجبور کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا ہے ناراض کیوں ہوتی ہو میری جان۔رقیہ شدید حقارت آمیز لہجے میں اسے خوب بُرا بھلا کہتی ہے۔مگر وہ جنسی جنون میں اس کو زبردستی اپنی آغوش میں دبا لیتا ہے۔مزید اپنی ہوس کو مٹانے کے لیے اس کا جمپر بھی سینے سے چاک کر دیتا ہے۔لیکن رقیہ اس کی گرفت سے چھوٹ کر بھاگنے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔مگر وہ اس غریب کو پھر دبوچ لیتا ہے۔جب رقیہ کا کوئی بس نہیں چلتا ہے تو وہ اپنی عفت و دوشیزگی کے تحفظ کی خاطر اس کے بازو میں اپنے دانت پیوست کر دیتی ہے۔ دلاور خاں اس کے کاٹنے کے درد کی تاب نہ لا کر مجبور محض ہو جاتا ہے۔اس کی رقیہ پر گرفت بھی ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔مزید اس کا جنسی جوش بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے، تو رقیہ کو اسے مجبوراً چھوڑنا پڑتا ہے اور یہ کہتا ہوا گھر سے چلا جاتا ہے کہ تو پچھتائے گی۔اس کے جانے کے بعد رقیہ کچھ دیر تک روتی رہتی ہے۔وہ اس معاملہ کے پیش آنے کے بعد بھی ضبط وتحمل سے کام لیتی ہے۔وہ اپنی چھوٹی بہنوں کے اسکول سے لوٹنے سے قبل ہی معمول کے مطابق نہا دھو کر تیار ہو جاتی ہے۔تاہم وہ یہ سوچتی ہے کہ اس بارے میں امی سے کچھ نہیں بتاؤں گی، ورنہ امی اپنے گناہ پر شرمندہ ہوں گی۔

کچھ دیر بعد رقیہ کی دونوں چھوٹی بہنیں اسکول سے آجاتی ہیں۔وہ اپنے اسکول کے فنکشن کے بارے میں ہنس ہنس کر تمام باتیں سناتی ہیں۔مگر سوچ میں ڈوبی ہوئی رقیہ کچھ نہیں سن پاتی بلکہ اسی دوران اس کے دانت بھینچ جاتے ہیں تو اس کی چھوٹی بہن منی کہتی ہے کہ باجی آپ کو کیا ہو

گیا۔ رقیہ، خود کو سنبھالتے ہوئے کہتی ہے کچھ نہیں۔ اس کی دونوں بہنیں کھانا مانگتی ہیں، تو رقیہ انھیں کھانا کھلاتی ہے۔ بعدازاں تینوں بہنیں آرام کے لیے لیٹ جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی امی آجاتی ہے۔ وہ بغیر کچھ معلوم کرے، رقیہ کو مارنے پیٹنے لگتی ہے، خوب جوتی سے جی بھر کر مارتی ہے۔ رقیہ کہتی ہے امی میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ مگر امی کچھ نہیں سنتی اور مارتی چلی جاتی ہے۔ جب وہ تھک جاتی ہے تو گالیاں بکتی رہتی ہے۔ وہ اپنے غصے کا ارتفاع ایسے جملے سے کرتی ہے جس کی توقع عموماً ایک ماں سے نہیں کی جاسکتی ہے۔ جملہ ملاحظہ ہو:

''میں پوچھتی ہوں، حرام زادی تیرا کیا گھس جاتا—؟''

رقیہ کی امی اپنا غصہ سرد پڑنے پر گھر سے باہر چلی جاتی ہے۔ رقیہ اس وقت امی کے تعلق سے تشویش میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کے دماغ میں کیا کیا باتیں گردش کرنے لگتی ہیں۔ وہ یہ بھی سوچتی ہے کہ امی اپنی آسودگی کی خاطر اسے بھی داؤ پر لگا دیں گی۔ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ رقیہ کی امی اس رات گھر دیر سے پہنچتی ہے۔ وہ چپ چاپ جا کر اپنے بستر پر لیٹ جاتی ہیں۔ مگر رقیہ کی نیند کہیں غائب رہتی ہے، تاہم اس کی آنکھ کسی وقت لگ جاتی ہیں، جب صبح رقیہ کی آنکھ کھلتی ہیں، تو وہ اپنی امی کو گھر نا پا کر مزید تشویش و اضطراب سے دوچار ہوتی ہے۔ وہ نہ جانے کیسے کیسے وسوسہ دل میں لیے ہوئے، خود کو آنے والے خطرات سے بچنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اس روز دونوں چھوٹی بہنوں کو اسکول جانے سے بھی روک لیتی ہے۔ ان کی امی شام کے وقت گھر لوٹتی ہے۔ تو تینوں بہنوں کی نظریں امی پر ٹک جاتی ہیں۔ ان کی امی باری باری سے ان کے چہروں کو دیکھتی ہے اور کہتی ہے کہ تم کو کیا ہو گیا ہے؟ رقیہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر اتنے میں امی اپنا ایک اہم فیصلہ سناتی ہے کہ میں نے اپنی بچی کی شادی طے کر دی ہے۔ رقیہ کے بولنے سے قبل ہی وہ پھر بول پڑتی ہیں۔۔۔ مراد سے۔۔۔ پھوپھی زاد بھائی مراد کا نام سنتے ہی رقیہ کی دونوں بہنیں کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہیں۔ اس کے بعد تینوں بہنیں ماں کے گلے کا ہار بن جاتی ہیں۔ ان تینوں کو گلے سے الگ کرتے ہوئے امی بولتی ہے مگر ایک شرط پر۔ رقیہ کو ایک دم سانپ سونگھ گیا۔۔۔ رقیہ ہونقوں کی طرح امی کی شرط کا انتظار کرنے لگی۔ تمھیں آج ہی اور اسی وقت میری دونوں سلائی مشینوں کی صفائی کرنی ہوگی۔ یہ سن کر رقیہ امی کے گلے سے لپٹ جاتی ہے۔ دونوں ماں بیٹی کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہنے لگتی ہیں۔ اس افسانہ میں رقیہ کا مزاحمت اور اخلاق سے مزین نمائندہ کردار فطری طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ معاشرے کی باکردار لڑکیوں کی عفت و آبرو کا مثبت استعارہ ہے۔ جو ہمارے سماج میں صحتمند معاشرے کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔

ڈاکٹر نگار عظیم کے افسانوں کی زبان عام فہم اور فطری معلوم ہوتی ہے۔ ان کے افسانے حقیقت نگاری اور رومانویت کی بھرپور چاشنی کے ساتھ سماجی و خانگی مسائل کی خاطر خواہ عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ان کے تحریری اسلوب کی کیفیت کو قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ جیسے بے تکان لکھتی جا رہی ہیں۔ قاری بھی بغیر کسی اکتاہٹ کے ایک ہی نشست میں کئی کئی کہانیاں پڑھ لیتا ہے۔ یہی ان کے افسانوں کی جان ہے۔ نگار عظیم کے افسانوں کے خواتین کردار مردانگی، تقدس اور زندگی کو پاک دامنی کے ساتھ گزارنے کی تعلیم و تلقین کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہنے میں مجھے کوئی گریز نہیں کہ رقیہ کا کردار ہمارے معاشرے کی لڑکیوں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ نگار عظیم کی بیشتر کہانیاں اس قدر مختصر ہیں، کہ جب قاری پڑھتے ہوئے، کہانی کا عروج محسوس کرتا ہے اس وقت ان کی کہانی کا اختتامیہ ہوتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس ڈاکٹر نگار عظیم کی کہانیوں کے متعلق لکھتے ہیں۔:

''نگار عظیم جب کہانیاں لکھتی ہیں، تو انسانی سماج اور انسانی سیرت، دونوں کے ناسور اور نہاں خانے ان کے تخیل میں روشن ہوتے ہیں۔ متوسط طبقے کی شائستہ، معنی خیز لیکن فشار آلود زندگی ان کا خاص موضوع ہے۔ وہ عصمت چغتائی کی طرح اپنے ماحول اور زندگی کی سچائیوں کو اس طرح ڈوب کر تیکھے شفاف اور بے باک لہجے میں بیان کرتی ہیں کہ بعض لوگ سوچتے ہیں 'وہ کہانی نہیں لکھتیں خود کہانی انھیں لکھتی ہے۔''

(نگار عظیم، گہن)

پروفیسر قمر رئیس کی اس رائے سے بیشتر ناقدین اتفاق کریں گے کہ حقیقت یہی ہے کہ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے قارئین پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نگار عظیم کہانی نہیں لکھ رہی ہیں بلکہ خود کہانی ان کو لکھ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت سے افسانہ نگاروں کی طرح لکھاڑی نہ بن سکیں۔ جن کی تخلیقات پے در پے منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ ان کی تخلیق یعنی کوئی کہانی، اسی وقت صفحۂ قرطاس پر اترتی ہے، جب کہانی ان کو لکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ معروف فکشن نگار جوگندر پال، نگار عظیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آپ اتنی فراواں اور بے دھڑک ہیں کہ آپ کے مستقبل سے واقعی بہت سی امیدیں بندھنے لگتی ہیں۔'' (ص)

جوگندر پال نے اپنے خیال کے مطابق نگار عظیم سے جو توقعات وابستہ کی تھیں۔شاید وہ اس پر پوری طرح کھری نہیں اترتی ہیں تاہم پھر بھی وہ بڑی بے باک ہیں انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں صاف گوئی اور بے باکی ضرور جھلکتی ہے۔

ڈاکٹر نگار عظیم نے سماج کے بہت سے چھوٹے بڑے گھریلو مسائل کو اپنے افسانوں کے قالب میں ڈھال کر قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔حقیقت امر یہ ہے کہ تخلیق کار کے لیے کوئی بھی واقعہ چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی حساسیت، حالات اور موقع محل اس کو چھوٹا بڑا بنا دیتے ہیں۔ان کے افسانوی مجموعہ 'عمارت' کی اشاعت 2010 میں عمل آئی۔اس کے بیشتر افسانے بہت سے رسائل میں چھپ کر، مجموعہ کی شکل میں آنے سے قبل ہی قارئین اور ناقدین کی توجہ مبذول کر چکے تھے۔انھوں نے دیگر افسانوں کی طرح اس افسانوی مجموعہ کی کہانیوں میں بھی معاشرے کے ایسے مسائل کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ جو ہمارے معاشرے کے گلی محلے میں غربت زدہ زندگی گزارنے والے لوگوں کے قطعی جیتے جاگتے مسائل معلوم ہوتے ہیں۔انھوں نے معاشرے کے ایسے افراد کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔افسانہ نگار نے اپنے مشاہدہ میں آئے ہوئے،ان لوگوں کے مسائل اور جذبات و احساسات کو بڑی فن کاری سے افسانوں کا حصہ بنا دیا ہے۔یوں تو ان کے افسانے بڑے ہی مختصر ہیں مگر ان کا بیانیہ بہت خوب ہے۔ہاں ان کے افسانے عام نظر میں بڑے سادہ سے معلوم ہوتے ہیں مگر جب ان پر گہرائی سے تحمل کے ساتھ غور کرتے ہیں تو اس میں ہمارے معاشرے کے بہت سے گھرانوں کے بڑے تشویشناک مسائل نظر آتے ہیں۔جس کے باعث وہ گھر اخلاقی اور مالی طور پر برباد ہو گئے ہیں۔عام طور پر ان کے افسانوں کے موضوعات عورت، جنس، موت اور اخلاق کے گرد گردش کرتے ہیں۔جن سے ہم صرف نظر نہیں کر سکتے ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''عمارت'' کا ایک افسانہ 'ابورشن' ہے جس کے عنوان پر نظر پڑتی ہے تو قاری کا ذہن اسقاط حمل کی طرف متوجہ ہوتا ہے، جب کہ افسانہ میں اس کے متعلق کوئی بات سامنے نہیں آتی ہے۔ ہاں اس میں افسانہ نگار نے ان مردوں اور عورتوں کی منفی ذہنیت کا ضرور ابورشن کرنے کی کوشش کی ہے جو معاشرے میں یک طرفہ طور پر عورت کے استحصال کی وکالت بڑے شد و مد سے کرتے ہیں۔اس کی مظلومیت کی کہانیاں سنانے کے لیے تقریبات بھی منعقد کرتے ہیں۔مگر نگار عظیم کا نظریہ قدر مختلف ہے جو مبنی بر حقیقت بھی ہے۔افسانہ کے اقتباس پر توجہ دیجیے۔:

''ومن لبریشن۔عورت پر ظلم اور بربریت کی بڑی بڑی مثالیں، جہیز، طلاق اور عورت کو زندہ جلا دینے والے اذیت ناک واقعات، عورت کا مستقبل، تعلیم نسواں، شوہروں کی زیادتیاں، ان پڑھ عورت کے مسائل، اس مذاکرے میں حصہ لے کر مجھے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔کیونکہ مجھے لگا سب کے سب وہاں عورت کے مسائل پر کم اور مرد کے خلاف زیادہ محاذ آرائیاں کر رہے ہیں۔جب کہ میرا نظریہ ذرا مختلف تھا۔عورت ظلم سہے گی تو ظلم ہوتا رہے گا۔ظلم سہنا بند کر دے گی تو ظلم کے راستے بند ہو جائیں گے۔سیکڑوں مثالیں ہیں۔ عورت پر عورت کے ظلم کی۔ان کا ذکر کیوں نہیں ہوتا؟''

(عمارت)

اردو زبان و ادب کے علمی حلقہ میں خواتین نے نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔اردو فکشن کی معروف اور کم عمر صنف افسانہ میں خواتین کی نمائندگی بڑی مستحسن ہے۔ان کی تخلیقات اور نگارشات رسائل اور اخبارات میں متواتر شائع ہوتی رہتی ہیں۔وہ سماج کا اہم جزو ہیں جو سماجی زندگی کے ہر دور میں مختلف شکلوں میں اپنی نمائندگی کا احساس کراتی رہی ہیں۔عہد حاضر میں ماضی کے بالمقابل، اب اس پر پابندیاں بہت کم ہیں۔ان کی آزادی، خاص طور سے تعلیمی میدان میں روز افزوں ہے۔وہ نہ صرف گھر کی مالک ہیں بلکہ اظہار رائے میں خود مختاری کا خوب مظاہرہ کر رہی ہیں۔ڈاکٹر نگار عظیم معاصر خواتین افسانہ نگاروں میں کئی دہائی سے اپنے اسلوب نگارش کے باعث نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ان کے افسانوں کے موضوع اور کردار ہمارے معاشرے کی معاشرت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ان کی کہانیوں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے قاری کو گرفت میں لے لیتی ہیں جو کسی فن کار کی تخلیق کی روح حیات ہوتی ہے۔

□□□

Dr. Sarfaraz Javed
R-155,Gali No- 6,
Sir syed Road, Jamia Nagar
Okhla,New Delhi-110025
Mob: 9971895740
javedsarfaraz@yahoo.in

ڈاکٹر ترنم خان

امن کے فروغ میں خواتین کا کردار

امن کی تعریف:

امن ایک حالت ہے جو کسی بھی قسم کے جھگڑے اور تشدد کے بغیر ہوتی ہے۔ یہ ایک معاشرتی، سیاسی، اور روحانی حالت ہے جو انسانی حقوق کے تحفظ اور ترقی کی ضمانت ہوتی ہے۔ امن کی تعریف مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہوسکتی ہے، مگر اس کی بنیاد یہی ہے کہ وہ ایک حالت ہوتی ہے جس میں جھگڑا اور تشدد کی عدم موجودگی ہوتی ہے۔ امن دشمنی اور تشدد کی غیر موجودگی میں سماجی دوستی اور ہم آہنگی کا تصور ہے۔ سماجی معنوں میں، امن عام طور پر تنازعات کی کمی (جیسے جنگ) اور افراد یا گروہوں کے درمیان تشدد کے خوف سے آزادی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

امن کی اہمیت:

آج کی دنیا میں امن اور مفاہمت کی اہمیت کو ناقابلِ انکار قرار دیا گیا ہے۔ معاشرتی، سیاسی، اور معاشی بحرانات، تشدد، اور جنگ سے متعلق واقعات نے امن کی ضرورت کو اور بڑھا دیا ہے۔ امن اور مفاہمت کی فراہمی کے بغیر، کوئی معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا اور کوئی بھی ملک مضبوط اور مستحکم نہیں ہوسکتا۔

امن کی اہمیت کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لیے ہمیں صرف امن کے فوائد کو نہیں بلکہ امن کی عدم موجودگی کے نقصانات کو بھی دیکھنا ہوگا۔

امن کی فراہمی معاشرتی امن، معاشی ترقی، اور انسانی حقوق کی پاسداری میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ امن کی فراہمی کے بغیر، معاشرتوں میں تشدد اور جنگ کی زد میں ملکوں کی ترقی رک جاتی ہے اور عوام کو ناکامی اور نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

امن کے فروغ میں خواتین کا کردار:

عورتوں کا امن کے فروغ میں اہم کردار ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کی بنیاد کو مضبوط بناتی ہیں اور امن اور مفاہمت کی بنیادیں رکھتی ہیں۔ عورتیں امن کے فروغ میں کئی مختلف کردار ادا کرتیں ہیں۔ عورتوں کی اہمیت امن کے فروغ میں ناقابل تسخیر ہے، اور ان کے شمولیت کے بغیر امن اور مفاہمت کا خواب ممکن نہیں ہوسکتا۔ ان کی شمولیت اور ان کے کردار کو معاشرتی، سیاسی، اور اقتصادی ترقی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔

عالمی سطح پر امن کے فروغ کے لیے کوشاں خواتین:

عورتیں دنیا بھر میں امن اور مفاہمت کے فروغ کے لیے مختلف اداروں، غیر حکومتی تنظیموں، اور انفرادی سطح پر مسلسل کوشاں ہیں۔ ان کا کردار امن میں موثرہ اضافہ کرتا ہے اور معاشرتی بنیادوں میں تبدیلی لاتا

ہے۔ان کے اقدامات اور کارکردگیاں عورتوں کی بھرپور اہمیت اور ان کی صورتحال میں بہتری لانے کے لیے نمایاں ہیں۔امن کے فروغ کے لیے کوشاں معروف خواتین کی فہرست بہت لمبی ہے۔ جن میں سے امن کے لیے نوبل انعام یافتہ خواتین سرفہرست ہیں:

برتھا، بیرونس وون سٹر (Baroness Bertha von Suttner) ایک آسٹریائی ناول نگار تھیں اور ایک امن پسند خاتون تھیں۔ان کا نام نوبل امن انعام کے قیام میں آلفریڈ نوبل کو متاثر کرنے کے لیے لیا جاتا ہے، جو آپ کو 1905 میں موصول ہوا۔آپ کا اہم ترین ناول،" دی وافن نیدر!" Lay 1889!Die Waffen nieder (Down Your Arms!)) ہے۔اس عنوان نے بہت سے لوگوں کو جذباتی کیا اور اس کے پیغام نے دنیا میں دھوم مچادی۔1870 کی دہائی میں آپ الفریڈ نوبل کے قریبی دوست بنیں، اور سالوں تک امن کے موضوع پر مکالمہ کیا۔امن انعام یافتہ ایک بین الاقوامی امن تحریک کی رہنما بنیں، اور 1891 میں آسٹریائی امن سوسائٹی قائم کی۔مردوں کی حکومت والی امن کانگریسوں میں وہ ایک آزاد خیال اور طاقتور رہنما کے طور پر نمایاں تھیں۔نئی صدی کی ابتدا میں انھیں "امن تحریک کی جنرلسیمو" (generalissimo of the peace movement) کہا جاتا تھا۔

جین ایڈمز (Jane Addams) نوبل امن انعام حاصل کرنے والی دوسری خاتون تھیں۔آپ نے 1919 میں ویمنز انٹرنیشنل لیگ فار پیس اینڈ فریڈم (Women's International League for Peace and Freedom) کی بنیاد رکھی، اور بڑی طاقتوں کو غیر مسلح کرنے اور امن معاہدہ کرنے کے لیے کئی سالوں تک کام کیا۔امریکہ میں، جین ایڈمز نے غریبوں کی مدد کرنے اور بچوں کو صنعتی مزدور کے طور پر استعمال کرنے سے روکنے کے لیے کام کیا۔وہ شکاگو میں ہل ہاؤس چلاتی تھی، ایک ایسا مرکز جس نے خاص طور پر تارکین وطن کی مدد کی۔پہلی جنگ عظیم کے دوران، آپ نے نیدرلینڈ کے ہیگ میں منعقدہ امن کے لیے خواتین کی کانفرنس کی صدارت کی، اور امریکہ کے صدر ووڈرو ولسن کو متحارب ممالک کے درمیان امن کے لیے ثالثی کرنے کی ناکام کوشش کی۔جب امریکہ اس کے بجائے جنگ میں داخل ہوا تو جین ایڈمز نے اس کے خلاف بلند آواز میں بات کی۔اس کے نتیجے میں آپ کو ایک خطرناک بنیاد پرست اور امریکی سلامتی کے لیے خطرہ قرار دیا گیا۔ایڈمز نے 1919 میں جرمنی پر زبردستی کیے گئے امن معاہدے کی تنقید کی اور کہا کہ یہ اتنا ذلت آمیز تھا کہ اس سے جرمنی کی انتقامی جنگ شروع ہو جائے گی۔اپنی زندگی کے اختتام پر، جین ایڈمز کو امن کے لیے ان کی کوششوں کے لیے امریکی حکومت نے اعزاز سے نوازا۔

ایملی گرین بالچ (Emily Green Balch) کو تاعمر تخفیف اسلحہ اور امن کے لیے کام کرنے پر 1946 میں نوبل امن انعام دیا گیا، انھیں امریکی حکومت کی طرف سے کوئی مبارکباد نہیں ملی۔سرکاری امریکی طویل عرصے سے آپ کو ایک خطرناک بنیاد پرست تصور کرتا تھا۔ماہر عمرانیات بالچ نے مزدوروں، مہاجرین، اقلیتوں اور خواتین کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا۔پہلی جنگ عظیم کے دوران آپ نے 1931 کے امن انعام یافتہ جین ایڈمز کے ساتھ کام کیا تاکہ غیر جانبدار ممالک کے سربراہان کو جنگ کو روکنے کے لیے مداخلت کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔جب امریکہ جنگ میں داخل ہوا تو جنگ مخالف مہم چلانے والوں ایڈمز اور بالچ کو خطرناک مخالف قرار دیا گیا۔1935 میں ایملی گرین بالچ ویمنز انٹرنیشنل لیگ فار پیس اینڈ فریڈم (Women's International League for Peace and Freedom) کی رہنما بنیں۔آپ نے فسطائیت کے خلاف خبردار کیا، اور ہٹلر اور مسولینی کی جارحانہ پالیسیوں کو روکنے کی کوشش نہ کرنے پر مغربی جمہوریتوں پر تنقید کی۔

بیٹی ولیمز اور میریڈ کوریگن (Betty Williams and Mairead Corrigan) کو 1977 میں نوبل امن انعام ملا۔1976 میں انتخاب کے عمل کے دوران، ناروے کی نوبل کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اس سال کی نامزدگیوں میں کوئی بھی الفریڈ نوبل کی وصیت میں ذکر شدہ شرائط کو پورا نہیں کرتی۔نوبل فاؤنڈیشن کے قوانین کے مطابق، ایسی صورت میں نوبل انعام اگلے سال تک محفوظ رکھا جا سکتا ہے، اور اس کے بعد اس قانون کا اطلاق کیا گیا۔بیٹی ولیمز اور مائریڈ کوریگن کو اس لیے ایک سال بعد، شمالی آئرلینڈ میں پرتشدد تنازعات کے خاتمے کے لیے ایک تحریک کی بنیاد رکھنے کی جرات مندانہ کوششوں کے لیے 1977 میں 1976 کا نوبل انعام ملا۔

مدر ٹیریسا (Mother Teresa) ایک معروف کیتھولک عورت تھیں جنھوں نے تاعمر امن اور محبت کی خدمت کی۔مدر ٹیریسا کی زندگی امن اور محبت کے پیغام کی نمایاں مثال ہے۔مدر ٹیریسا نے ہزاروں بیماروں، لاچاروں، اور غریبوں کی مدد کی اور ان کے لیے رہائش فراہم کی۔مدر ٹیریسا نے دیکھا کہ دنیا بھر میں بہت سارے افراد غربت، بیماری، اور مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں اور انھیں امن اور محبت کی ضرورت ہے۔

ان کی معروف تاثرات میں سے ایک وہ لمحہ ہے جب انھوں نے بھوکے بچوں کو خوراک فراہم کرنے کے لیے شہری حکومتوں پر دباؤ بنایا۔ مدر ٹیریسا نے بچوں کے مستقبل کی فکر کرتے ہوئے "بچوں کا گھر" اور" بچوں کی دکانیں" کی بنیاد رکھی، جو کہ بیوہ، اور زندگی سے لاچار افراد کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بنیادی مدد فراہم کرتی ہیں۔ مدر ٹیریسا نے امن اور محبت کے پیغام کو پہنچانے کے لیے زندگی بھر محنت کی۔ ان کی خدمات امن اور مفاہمت کے پیغام کی مثال ہے۔

سویڈن کی الوامیرڈل (Alva Myrdal) اور میکسیکو کے الفانسو گارسیا روبلز نے مشترکہ طور پر 1982 کے لیے امن کا نوبل انعام حاصل کیا، انھوں نے کئی سالوں سے اقوام متحدہ کے تخفیف اسلحہ کے مذاکرات میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ جنیوا میں تخفیف اسلحہ کے مذاکرات اور بہت سے دیگر بین الاقوامی اداروں میں، نیز اپنی تحریروں میں، الوامیرڈل نے پوری دنیا میں رائے عامہ کو ہتھیاروں کے مسائل سے آگاہ کیا، اور ترقی کے لیے ذمہ داری کا عمومی احساس بیدار کرنے میں مدد کی۔ الفریڈ نوبل کی وصیت میں کہا گیا ہے کہ امن انعام اس شخص یا افراد کو دیا جائے گا جنھوں نے امن، تخفیف اسلحہ اور بنی نوع انسان کے بھائی چارے کے لیے خصوصی تعاون کیا ہو۔ نوبل کمیٹی کی رائے میں اس سال کے انعام یافتہ افراد ان شرائط کو پورا کرتے ہیں۔

ریگوبرتا مینچو (Rigoberta Menchú Tum)، گوئٹے مالا کی ایک مایا ہندوستانی کو 1992 میں مقامی لوگوں کے حقوق کے احترام پر مبنی سماجی انصاف اور نسلی ثقافتی مفاہمت کے لیے ان کے کام کے اعتراف میں امن کا نوبل ایوارڈ ملا۔ سرکاری فوجیوں نے ان کی والدہ اور بھائی کو بے دردی سے قتل کر دیا تھا کیونکہ ان کے والد نے زمینداروں کی مخالفت کی تھی اور آخر کار فوجیوں نے ہسپانوی سفارت خانے کو آگ لگادی تھی جہاں والد اور دیگر لوگ پر امن احتجاج کر رہے تھے اور سب کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ آپ کی پوری زندگی کی کہانی ایک قابل ذکر کارنامے کی نمائندگی کرتی ہے۔ دبے ہوئے لوگوں کے درمیان انتہائی غربت میں پیدا ہوئی، آٹھ سال کی عمر سے کام کر رہی تھی۔ وہ کہتی ہیں " میرا بچپن کبھی نہیں تھا" ۔ وہ اپنے چرچ میں بنیادی تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی، جہاں آپ نے پہلی بار اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا، خود ہسپانوی زبان سیکھی تا کہ دنیا کو اپنے لوگوں کے دکھوں کے بارے میں بتا سکیں اور اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے اپنی جان کے خوف سے میکسیکو میں جلاوطنی کی طرف دھکیل دیا، آپ نے قیادت اور سفارت کاری کی مہارتیں پیدا کیں۔ جیسا کہ انعام کے اعلان کے وقت کہا گیا ،" آج، Rigoberta Menchú کھڑی ہیں، اپنے ملک میں، امریکی براعظم اور دنیا میں نسلی، ثقافتی اور سماجی تقسیم کے خطوط پر امن اور مفاہمت کی ایک واضح علامت کے طور پر۔"

جوڈی ولیمز (Jody Williams) ایک امریکی سیاسی کارکن ہیں جو انفرادی بارودی سرنگوں پر پابندی لگانے، انسانی حقوق (خاص طور پر خواتین کے حقوق) کے اپنے دفاع اور آج کی دنیا میں سلامتی کے بارے میں نئی تفہیم کو فروغ دینے کے لیے ان کی کوششوں کے لیے مشہور ہیں۔ انہیں 1997 میں اینٹی انفرادی بارودی سرنگوں پر پابندی لگانے اور منسوخ کرنے کے لیے کام کرنے پر امن کا نوبل انعام دیا گیا۔

شیریں عبادی (Shirin Ebadi) ایک ایرانی نوبل انعام یافتہ، وکیل، مصنف، استاد اور سابق جج اور ایران میں انسانی حقوق کے محافظوں کے مرکز کی بانی ہیں۔ 2003 میں، عبادی کو جمہوریت اور خواتین، بچوں اور پناہ گزینوں کے حقوق کے لیے ان کی نمایاں کوششوں کے لیے نوبل امن انعام سے نوازا گیا۔ وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والی پہلی مسلم خاتون اور پہلی ایرانی تھیں۔

وانگاری موٹا ماتھائی (Wangari Maathai) کینیا کی ایک سماجی، ماحولیاتی اور سیاسی کارکن تھیں جنھوں نے گرین بیلٹ موومنٹ کی بنیاد رکھی، یہ ایک ماحولیاتی غیر سرکاری تنظیم ہے جو درخت لگانے، ماحولیاتی تحفظ اور خواتین کے حقوق پر مرکوز ہے۔ 2004 میں وہ امن کا نوبل انعام جیتنے والی پہلی افریقی خاتون بن گئیں۔

امن کا نوبل ایوارڈ مشترکہ طور پر ایلین جانسن سرلیف (Ellen Johnson Sirleaf) لائبیریا، لیمہ گووی (Leymah Gbowee) لائبیریا اور توکل کرمان (Tawakkul Karman)، یمن کو ان کی خواتین کے تحفظ اور امن کے قیام کے کاموں میں مکمل شرکت کے لیے خواتین کے حقوق کے لیے ان کی عدم تشدد کی جدوجہد پر دیا گیا ہے۔ ایلین جانسن سرلیف افریقہ کی پہلی خاتون جمہوری طور پر منتخب شدہ حکومتی سربراہ ہیں۔ جانسن سرلیف نے 2005 میں حکومت میں آ کر ملک میں امن اور معاشی ترقی کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے خواتین کے حقوق کو مضبوط کیا، اظہار خیال کی آزادی کو وسعت دی اور دوسرے افریقی رہنماؤں کے لیے مثال بنیں۔ لیمہ گووی نے 2002 میں گراس روٹس موومنٹ کا انعقاد کیا، وومن آف لائبیریا ماس ایکشن فار پیس ، جس میں ملاقاتیں کی گئیں جن میں عیسائی اور مسلم خواتین نے مشترکہ طور پر امن اور عدم تشدد کا پیغام پیش کیا۔ ان مظاہرات نے صدر چارلس ٹیلر پر 2003 میں امن کا معاہدہ پر

دستخط کرنے کے لیے دباؤ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ طوکل کرمان ایک یمنی صحافی ہیں۔ وہ صدر صالح کی غیر جمہوری حکومت کے خلاف کئی احتجاجات کی قیادت کرتی رہیں، جمہوریت اور اظہار خیال کی آزادی کی مانگ کرتی رہیں۔ انھوں نے تنظیم" وومن جرنلسٹس وداؤٹ چینز" کی بنیاد رکھی، اور ان کی فعال مشارکت کی بنا پر انھیں زندان میں ڈالا گیا۔

نادیہ مراد باسی طحہ (Nadia Murad Basee Taha) کو جنگ اور مسلح تصادم کے ہتھیار کے طور پر جنسی تشدد کے استعمال کو ختم کرنے کی کوششوں کے لیے 2018 میں امن کا نوبل انعام ملا۔ نادیہ مراد شمالی عراق کے گاؤں کوجو میں پلی بڑھی ہیں۔ 2014 میں، اسلامک اسٹیٹ (IS) نے کوجو کو فتح کیا اور کئی سو مردوں اور بزرگ خواتین کا قتل عام کیا۔ اکیس سالہ نادیہ مراد اور دیگر نوجوان خواتین کو اغوا کر کے جنسی غلام بنا کر رکھا گیا۔ کچھ مہینوں کے بعد نادیہ مراد فرار ہونے میں کامیاب ہوگئیں اور 2015 میں جرمنی پہنچ گئیں۔ وہاں آپ نے بین الاقوامی برادری کو بتانے کا انتخاب کیا کہ آپ کو کیا تکالیف ہوئی ہیں۔ مراد کو امید تھی کہ ایسا کرنے سے ان کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو ان کے جرائم کے لیے انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔ 2016 میں، انہیں انسانی اسمگلنگ سے بچ جانے والوں کے وقار کے لیے اقوام متحدہ کی پہلی خیر خواہ سفیر (Goodwill Ambassador) مقرر کیا گیا۔ نادیہ مراد نے ایک سوانح عمری لکھی ہے، ''دی لاسٹ گرل''۔ اپنے خلاف ہونے والے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے، وہ اس بات کو یقینی بنانے میں مدد کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ لڑکیوں اور نوجوان خواتین کی آئندہ نسلیں جنگ میں جنسی تشدد کا شکار نہ ہوں۔

ماریا ریسا (Maria Ressa) کو متعدد اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ اکتوبر 2021 میں انھیں" اظہار کی آزادی کے تحفظ کے لیے کوششوں کے اعتراف میں امن کا نوبل انعام دیا گیا، جو جمہوریت اور دیرپا امن کے لیے پیشگی شرط ہے۔" وہ Rappler کی شریک بانی ہیں، جو کہ فلپائن میں پریس کی آزادی کی جنگ کی قیادت کرنے والی سب سے بڑی ڈیجیٹل واحد نیوز سائٹ ہے۔ ریپلر کے سی ای او کی حیثیت سے، ریسا نے ڈوٹیرٹے حکومت کی طرف سے مسلسل سیاسی ہراسانی اور گرفتاریوں کا سامنا کیا، آزاد رہنے کے لیے دس بار ضمانت کرنے پر مجبور ہوئیں۔ 2022 میں انھیں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے انٹرنیٹ گورننس فورم کے لیڈرشپ پینل کے لیے مقرر کیا تھا اور وہ اس کی نائب صدر کے طور پر کام کرتی ہیں۔

نرگس محمدی (Narges Mohammadi) کو 2023 کا امن کا نوبل انعام ایران میں خواتین پر ظلم کے خلاف اور انسانی حقوق اور سب کے لیے آزادی کو فروغ دینے کے لیے دیا گیا تھا۔ نرگس محمدی کئی برس سے ایران میں خواتین کے ساتھ منظم امتیازی سلوک اور جبر کے خلاف لڑ رہی ہیں۔ وہ انسانی حقوق، آزادی اور جمہوریت کے لیے دلیرانہ لڑائی میں سب سے آگے ہیں۔ 1990 کی دہائی کے اوائل میں، محمدی نے مساوات اور خواتین کے حقوق کے لیے اپنی لڑائی شروع کی۔ 2003 میں وہ تہران میں انسانی حقوق کے محافظوں کے مرکز (Defenders of Human Rights Center) کے ساتھ شامل ہوگئیں، یہ تنظیم نوبل امن انعام یافتہ شیریں عبادی نے قائم کی تھی۔ محمدی نے قید کارکنوں اور ان کے خاندانوں کی مدد کی ہے۔ وہ سزائے موت کے خلاف اور ایرانی جیلوں میں حکومت کے منظم طریقے سے تشدد اور جنسی تشدد کے استعمال کے خلاف مہم چلانے میں سرگرم رہی ہیں۔ آزادی کی جدوجہد آپ کو بہت مہنگی پڑی۔ آپ کو 13 بار گرفتار کیا گیا اور 31 سال قید اور 154 کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔ اکتوبر 2023 میں، جب امن کے نوبل انعام یافتہ کے طور پر آپ کے انتخاب کا اعلان کیا گیا، تو آپ تہران کی جیل میں بند تھیں۔

ان خواتین نے مختلف امور میں اپنا کردار ادا کیا ہے، جیسے کہ تعلیم، صحت، حقوق کی پاسداری، آزادی، جمہوریت اور سیاست میں شرکت۔ ان کے اقدامات اور کارکردگیاں امن اور مفاہمت کے فروغ میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

حوالہ جات:

نوبل امن انعام۔" نوبل امن انعام یافتہ

https//:www.nobelprize.org/prizes/peace

یونائیٹڈ نیشنز عورتیں۔" عورتیں، امن، اور مفاہمت

https//:www.unwomen.org/en/what-we-do/peace-and-security

□□□

Dr. Tarannum Khan
Assistant Prof.
MANUU
College of Teacher Educatigon
Bhopal-462001 (M.P)
Mobile No. 9893809240
Email ID: tarannumfkhan@gmail.com

عصمت رحمان

آگ کے پاس بیٹھی عورت کا حاشیائی تجزیہ

اردو فکشن کی دنیا میں ایسی کئی مایہ ناز اور قابل قدر شخصیتیں گزری ہیں جنھوں نے اپنے ذاتی مطالعہ اور کمال فن کی بنیاد پر افسانوی ادب میں اپنی ایک منفرد اور قابل تحسین شناخت قائم کی ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے، ایسے ہی سرکردہ افسانہ نگاروں میں اقبال مجید کا نام سرفہرست ہے۔ اقبال مجید اردو دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ بیک وقت متنوع خوبیوں کے مالک ہیں، جہاں انہوں نے افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، مضمون نگاری اور تنقید نگاری میں اپنی تخلیقی کاوشوں کے جوہر دکھائے ہیں، وہیں الیکٹرانک میڈیا میں بھی اپنی ایک منفرد پہچان بنائی ہے لیکن جس صنف نے ان کے فن کو جلا بخشی وہ افسانہ نگاری ہے۔ مختلف ادیب، دانشور اور نقادان کے کمال فن اور معتدل افسانہ نگاری کے معترف ہیں۔ بقول ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی:

> "اقبال مجید ہمارے ان چند افسانہ نگاروں میں ہے جنھیں تقریباً چالیس سال کے تخلیقی سرگرمی نے نہ تھکایا ہے اور نہ خود کو دہرانے پر مجبور کیا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ان کا تخلیقی ذہن نئی نئی راہیں حتیٰ کہ تجرباتی زمینیں تلاش کرتا اور بسا اوقات حاصل کرتا رہتا ہے فکشن کے علاوہ ڈرامے اور تنقید میں اقبال مجید کے کارنامے مستزاد ہے"

(شہر بدنصیب، اقبال مجید، عزیز پرنٹنگ پریس، نئی دہلی، 1997، ص۔161)

مذکورہ بالا قول سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ اقبال مجید ہمارے عہد کے ان تخلیق کاروں میں سے ایک ہیں جو افسانوی ادب کی تاریخ کا اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔ اقبال مجید اردو ادب گاہ میں تقریباً ساٹھ سال تک مستعد و فعال ہی نہیں رہے بلکہ اپنے بہت ہی واضح اور روشن نقوش بھی چھوڑے۔ اقبال مجید 12 جولائی 1934 کو مرادآباد یوپی میں پیدا ہوئے۔ اقبال مجید نے چھٹی کی دہائی سے لکھنا شروع کیا "عدو چاچا" اقبال مجید کا پہلا افسانہ ہے جو 1956 میں رسالہ "شاہراہ" دہلی میں شائع ہوا اب تک اقبال مجید کے چھ افسانوی مجموعے جو کہ اس طرح ہیں:

دو بھیگے ہوئے لوگ" (1970) "ایک حلفیہ بیان" (1980) "شہرِ بدنصیب" (1997) "تماشا گھر" (2003) "آگ کے پاس بیٹھی عورت" (2010) "خاموش مکالمہ" (2019) منظر عام پر آکر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ "قصۂ رنگِ شکستہ" کے نام سے ان کے منتخب افسانوں کا مجموعہ 2011ء میں اے۔ جی پرنٹنگ سروسز کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو ناول بعنوان "کسی دن" (1998) اور "نمک" (1999) بھی شائع ہوئے ہیں۔ اقبال مجید جدید افسانہ نگار اور ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ڈرامہ نگار بھی تسلیم کیے جاتے ہیں "کتے" "چاندی کا زہر" "ٹسر پھنسا" "جرم و سزا" "پیسہ پیسہ پیسہ" "کمرہ" وغیرہ اقبال مجید سے یادگار کامیاب اسٹیج ڈرامے ہیں۔

اقبال مجید نے تحقیقی وتنقیدی میدان میں بھی اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی کتاب ''بشر دوستی اور نئی ترقی پسندی'' کے نام سے 2014 عیسوی میں عرشیہ پبلکیشنز دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ شروع میں میں نے جولفظ 'متنوع' استعمال کیا ہے وہ اقبال مجید کی رنگارنگ اور ہمہ جہت شخصیت پر بالکل صادق آتا ہے۔ مصنف نے افسانہ' ناول' ڈرامہ اور تنقید کے ساتھ ساتھ شاعری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اقبال مجید کی شاعری ان کی ہمہ گیر اور پہلودار شخصیت کا ایک اہم جزو ہے۔ ان کی کچھ آزاد نظمیں وقتاً فوقتاً رسالہ 'شب خون' میں شائع ہوئیں ہیں جن میں ''نظم''، ''گھوڑے کی آشنائی''، ''ایک چائے خانے میں'' اور 'مہنگا سودا'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اقبال مجید کے کئی افسانوں کا ترجمہ ہندی، مراٹھی انگریزی اور روسی زبانوں میں ہوا ہے۔ مرکزی ساہتیہ اکیڈمی کے انگریزی جریدے انڈین لٹریچر میں ان کی دو منتخبہ کہانیاں شائع کی گئی، محمد عمر میمن کی ادارت میں بین الاقوامی اشاعتی ادارے پینگون (penguin) کی جانب سے شائع ہونے والے اردو کے جدید افسانوں کی اینتھولوجی (Anthology) 1990 میں اقبال مجید کے ایک افسانہ کا انتخاب، ترجمہ اور اشاعت عمل میں لائی گئی، اسی کے ساتھ جدید اردو افسانے پر واشنگٹن امریکہ سے شائع ہونے والے مجموعے "TheTale Of The Old (Anthology) Fisherman" مرتبہ محمد عمر میمن میں آپ کا ایک افسانہ منتخب کیا گیا اور اس کی اشاعت عمل میں لائی گئی۔ آپ کو مختلف ادبی اور علمی کارناموں کے لیے کئی اہم اور مشہور انعام واکرام سے نوازا گیا جن میں کل ہند سطح کا میر تقی میر ایوارڈ، شکھر سمّان، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ اور غالب ایوارڈ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اقبال مجید نے بھوپال گیس المیہ پر خصوصی فیچر لکھنے پر 1987 میں اول قومی انعام حاصل کیا۔ مختلف علمی وادبی مراحل طے کرتے ہوئے بالآخر اقبال مجید 18 جنوری 2019 کو بھوپال میں رہتے ہوئے اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

اقبال مجید نے اگر چہ متنوع موضوعات کو تخلیق کا جامہ پہنایا ہے اور جن میں مختلف زاویوں اور نظریوں سے عصر حاضر کی تلخ حقیقتوں کی پردہ کشائی کی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے افسانوں میں سماج کے پچھڑے، دبے کچلے اور غیر متمول لوگوں کے استحصال کو کئی پہلوؤں سے برتا ہے۔ جس کی بہترین مثال ''آگ کے پاس بیٹھی عورت'' ہے۔ یہ افسانہ ان کے اسی نام کے افسانوی مجموعہ میں شامل ہے جو 2010 عیسوی میں شائع ہوا ہے یہ افسانہ اس مجموعہ کا بارہواں افسانہ ہے۔ یہ مضمون افسانہ ''آگ کے پاس بیٹھی عورت'' کا حاشیائی تجزیہ پیش کرتا ہے اور اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ اقبال مجید نے اس ڈیجیٹل دور میں دلتوں کے عصری مسائل کو کس طرح پیش کیا ہے اور ان کی حالت زار کو دریافت کرنے کے لیے کتنی ترش روئی سے کام لیا ہے اور حقیقت کی نوعیت کو کس طرح چھوٹے سے افسانے میں سمانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ سب سے پہلے میں حاشیہ کے ان تعریفوں کو پیش کرنا چاہوں گی جو مختلف اردو لغات میں ملتی ہیں۔ فیروز اللغات کے الفاظ یہ ہیں:

> ''حاشیہ۔ (حا۔شِ۔یہَ) [ع۔اِ۔مُذ] کنارہ۔ گوٹ۔ سنجاف' 2 کتاب یا ورق کے چاروں طرف خالی حصہ' 3 'شرح یا یادداشت جو کسی کتاب کے متن سے باہر لکھی جائے۔ نوٹ۔۔۔'' (فیروز اللغات، الحاج مولوی فیروز الدین، فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمیٹڈ، 1987، ص۔560)

نور اللغات کے مطابق:

> ''حَاشِیہَ۔ (ع۔حاشیتہ۔ بکسر سوم و فتح چہارم حَواشِی جمع) مذکر 1_ کنارہ۔ گوٹ۔ گور (۔لب 2_ کتاب یا ورق کے چاروں طرفوں کا کنارہ۔ کپڑے کا کنارہ۔ لکھے ہوئے صفحہ کا چاروں طرف کا کنارہ۔ 3_ شرح یا یادداشت جو کسی کتاب

کے متن سے باہر لکھی جائے۔نوٹ۔فُٹ نوٹ ۳ شرح کی شرح 47_ (اردو) وہ بیل بوٹے جو شال رومال یا قالین وغیرہ کے گرداگرد کناروں پر بنے ہوتے ہیں۔۔۔''

(نور اللغات، جلد دوم، مولوی نورالحسن نیر کاکوروی، جنرل پبلشنگ ہاوس، کراچی، پاکستان، ص۔447)

مذکورہ بالا تعریفوں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ تمام طبقات یا افراد جو سماجی، سیاسی، معاشی اور اقتصادی عمل و ترقی سے باہر یا کنارے پر کیے جاتے ہیں وہ ''حاشیہ'' کہلاتے ہیں. اظہار خضر نے حاشیہ کی تعریف یوں بیان کی ہیں۔

''سماجی تعلیمی اور اقتصادی سطح پر پسماندہ وہ طبقہ دلت اور حاشیائی ہے جو سماجی نظام کے مین سٹریم سے بظاہر تو الگ تھلگ نظر اتا ہے۔میرے نزدیک یہ حاشیائی کرداروں کا ایک Apparant Definition ہے! کیونکہ بظاہر تو وہ الگ تھلگ نظر اتے ہیں لیکن بہ باطن ہمارے سماجی، تعلیمی اور اقتصادی نظام میں ان کی شمولیت اور حصہ داری بھی فعال اور متحرک نظر آتی ہے!

(تجزیے، اظہار خضر، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ص۔216)

محولہ بالا قول میں اس بات کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح پنڈتوں، پروہتوں، سماج کے حق دباؤ ٹھیکے داروں اور سیاسی کارکنوں نے پسماندہ دلت اور حاشیائی طبقات کے حقوق کو روندا ہے۔''اگ کے پاس بیٹھی عورت''میں اقبال مجید نے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے افسانے کا اغاز یوں ہوتا ہے۔

''سور پالنے والوں کی بستی کی روزمرہ کی زندگی ان کی گندگی، ان کی عورتوں کی برہنگی اور ننگے دڑنگے کیچڑ میں لتھڑے اور گرد سے اٹے بالوں ناک بہاتے اور غلاظت میں لوٹتے بچوں پر فلم بنا کر بڑے انعامات کی دوڑ میں شامل ہونے والے فلم ساز بڑے کہانی کاروں کو پانچ ستارہ ہوٹل کے عالی شان کمروں میں ٹھہرا کر ان ناداروں پر لکھی جانے والی فلمی کہانیوں کے امکانات پر بحث کرتے اور اس موضوع پر ماضی میں بنائی گئی بعض فلموں کے کیسٹ ریپلے کر کے ان کی بخیہ ادھیڑتے۔ہوٹل کے انھیں کمروں کی صاف ستھری میزوں پر ان مظلوموں پر ہونے والے مظالم کی پرانی اخباروں کی چھپی تصویریں بکھری ہوتیں اور دل دہلا دینے والی ٹاپ اسٹوریز چائے کافی کی چمچماتی پیالیوں اور ایس ٹرے میں جلتی قیمتی سگریٹوں کے اس پاس چکنے کاغذ پر چھپے انگریزی رسالوں سے کاٹے گئے تراشے بھی پڑے ہوتے جن کی خوبصورت سطروں کے نیچے لال قلم سے جگہ جگہ خط بھی کھینچا ہوتا۔''

(آگ کے پاس بیٹھی عورت، اقبال مجید، فائن آفسیٹ پریس اردو بازار، دہلی، ص۔165)

اقبال مجید نے بڑی فنکارانہ چابک دستی سے فلم ساز اور کہانی کاروں کے ذریعے دلتوں بستی کے سچے اور تلخ حقائق کو بیان کیا ہے۔اس افسانے میں ملک کے دو متضاد طبقات کا موازنہ کیا گیا ہے۔سور پالنے والوں کی بستی ان کی کسم پرسی، برہنگی، بچوں کی لاغری اور کمزوری گندگی، غلاظت اور بہت ساری دقتیں اور آذیتیں جن کی برداشت کی تاب دلت اور حاشیائی طبقات میں ہی ہیں۔دوسری طرف فلم ساز اور کہانی کاروں کی ٹھاٹ بھاٹ، جو پانچ ستارہ ہوٹل کے عالیشان کمروں میں عیش و آرام سے بیٹھے سماج کے پچھڑے، دبے کچلے اور غیر متمول افراد کی لاچاری اور غریبی پر اپنی ترقی و ترویج اور بڑے انعامات کے ہوڑ میں فلم بنا رہے ہیں۔استحصال کی حد یہ ہے کہ پروڈیوسر اپنے مفاد کے لیے ان مظلوموں پر ہونے والے مظالم کو اپنی فلم میں تشدد (voilence) کے طور پر پیش کر رہا

ہے اور غلاظت سے پُر اور تشدد آمیز فلمیں بنا کر تماشائیوں کے جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ جب کہ خود اس کے الفاظ یوں ہیں:

''دیکھیے پیشہ وارانہ تشدد کا نظریہ یہ ہے کہ جس حقیقت کو آپ بیان کر رہے ہیں وہ سیدھی سیدھی ایک گھماسان جنگ کے علاوہ اور کچھ نہیں یہ آپ اچھی طرح سے جان لیجئے کہ ہمیں کسی پر تشدد عمل کے پیچھے اس کی سماجی پیچیدگیوں کو فوکس نہیں کرنا ہے ہم کوئی سماجی ذمہ داری نبھانے کے لیے فلم نہیں بنا رہے ہیں ہم کچھ ٹھیک کرنے یا کسی پرابلم کا حل بتانے کے لیے کام نہیں کر رہے ہیں۔''

(آگ کے پاس بیٹھی عورت، اقبال مجید، فائن آفسیٹ پریس اردو بازار، دہلی، ص۔167)

اقبال مجید نے پروڈیوسر کی سفاکی اور خود غرض فطرت کے پردے میں اُونچے طبقات کے حرص وطمع، مطلب پرستی اور خود کامی کو تشت از بام کیا ہے۔ عصر حاضر میں بھی دلت اور حاشیائی طبقات استحصال کے شکار ہیں آج بھی دلتوں کے بنیادی حقوق کو کچلا جاتا ہے ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ افسانہ ''آگ کے پاس بیٹھی عورت'' سماجی اور معاشی ناہمواریوں کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ دلت بھی اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ پروڈوسر، میڈیا اور باقی کہانی کار اپنے ذاتی مفاد کے لیے کس طرح بلاواسطہ اور بالواسطہ دلتوں کو استحصال اور تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں لیکن اس سیاسی، سماجی، معاشی اور صحافتی استحصال اور جارحانہ رویے کے خلاف برملا اظہار کی ان میں تاب نہیں۔

آگ کے پاس بیٹھی عورت کے ذریعے دلتوں کی داخلیت کے مسائل، جس میں ان کی ذات (شخصیت) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ذات جو اس ڈیجٹل دور کے ترقیوں کے ہجوم میں یاس ومحرومی سے شرابور ہے، اور جس کی جبلت کو کمتر اور عقل وشعور کو حقیر تصور کیا جاتا ہے، سماجی، معاشی اور سیاسی آمریت کی وجہ سے اس ذات کے اندر پل رہے غصے کو ایک ایسی آگ کے طور پر دکھایا گیا ہے جو پوری طرح نہ سلگتی ہے نہ بجھتی ہے۔

اس افسانے کے آخر یعنی کلائی میکس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ڈائریکٹر کس طرح جھوٹے بھائی چارے اور ہمدردی کے دکھاوے کے طور پر ٹوٹے پھوٹے المونیم کے گلاس میں پانی پیتا ہے لیکن جب اس پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ ''دراصل یہ گلاس سور کے بچوں کے دودھ پینے کا گلاس ہے'' تو وہ سناٹے میں آجاتا ہے۔ اقبال مجید نے دراصل اس افسانے کے پس منظر میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جدید شہروں میں رہنے والے دلتوں کو اس بات کی کوئی امید اور خوبھی نہیں ہے کہ کوئی ان کے مصائب و مشکلات کا مداوا کر سکتا ہے، وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ فلم ساز، میڈیا کے کارکردہ اور دوسرے کہانی کار اپنے ذاتی مفاد کے لیے ان پر کیے گئے مظالم اور تشدد کو کیمرے کی انکھ میں اتارنا چاہتے ہیں۔ اگر چہ اس سب کے برملا اظہار کی ان میں طاقت نہیں لیکن آگ کے پاس بیٹھی ہوئی عورت اپنے اندر سلگتے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے عملاً ڈائریکٹر کو المونیم کے گلاس میں پانی دیتی ہے الغرض یوں کہا جا سکتا ہے کہ پروڈیوسر روایتی دلتوں کی پسماندگی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان پر فلم بنانے لگا تھا لیکن اس سائنسی اور ٹیکنالوجی کے دور کے دلتوں کا عقلی اور احساسی شعور پختہ ہو چکا ہے اب وہ مظالم کو سہنے کے ساتھ ساتھ ان کا جواب دینے کی بھی قوت رکھتے ہیں، اس لیے جب کھیانے بار بار پروڈیوسر سے کہا کہ یہ گلاس آپ کے پانی پینے کے قابل نہیں ہے پھر بھی عورت اپنے استحصال کا انتقام لینے کے لیے پروڈیوسر کو المونیم کے ٹوٹے پھوٹے گلاس میں پانی پلانے کی سعی کرتی ہے جس میں وہ بالآخر کامیاب بھی ہوتی ہے۔ اس افسانے میں آگ کے پاس بیٹھی ہوئی عورت کے ذریعے جدید شہروں میں دلت سماج کے اندر پلنے والی نفرت کو بیان کیا گیا ہے۔ ''آگ کے پاس بیٹھی عورت'' میں پروڈیوسر بظاہر مرہم معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً اس کی موجودگی زخموں پر نمک کی مانند ہے، گویا پروڈیوسر ترحم کے پس پردہ دلتوں کی تماش بینی بھی کرتا ہے۔

□□□

Asmat Rehman
Research Scholar
Deptt. of Urdu
Central University of Kashmir
Srinagar-191201 (J & K)
asmatrehman475@gmail.com

رقیہ مقصود

غزال ضیغم کے افسانوں میں تانیثی شعور

''ایک ٹکڑا دھوپ کا'' کے خصوصی حوالے سے

اردو افسانے میں جن خواتین تخلیق کاروں نے بلا واسطہ تانیثی فکر و سوچ کو اپنے بے مثل آہنگ سے پدر سری سماج کی خامیوں، عورتوں کے مسائل، ان پر روا ظلم و ستم، جبر و استحصال اور نسائی جذبات و احساسات کو رقم کیا ہے، ان میں رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، نگار عظیم، ثروت خان، بانو قدسیہ، صادقہ نواب سحر کا نام قابل ذکر ہے۔ تانیثی ادب کی خواتین علمبرداروں کی اس فہرست میں منفرد لب و لہجے کی مالک غزال ضیغم کا نام بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔

غزال ضیغم اگرچہ ادبی دنیا میں بحیثیت افسانہ نگار ایک خاص مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہیں تاہم افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ وہ بہترین مترجم اور کامیاب ڈراما نگار کے طور پر بھی اپنا لوہا منوا چکی ہیں۔ گویا غزال ضیغم ہمہ جہت شخصیت کی مالک قلم کار ہیں۔ اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے ''ایک ٹکڑا دھوپ کا'' (2000) اور ''مدھوبن میں رادھیکا'' (2014) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

غزال ضیغم افسانہ نگاری کے فن سے بخوبی واقف ہیں اور وہ افسانے کے تمام فنی لوازمات کو برتتے ہوئے اپنے افسانے تخلیق کرتی ہیں۔ وہ پیچیدہ اسلوب سے انحراف کر کے سادہ، سپاٹ اور دلکش اسلوب اختیار کر کے اپنے افسانوں میں جاذبیت پیدا کرتی ہے۔ زبان و بیان اور الفاظ کی ادائیگی پر بھی خاصی گرفت رکھتی ہیں، جس کی مثال دیہی اور شہری کرداروں کے ذریعے جگہ جگہ ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

غزال ضیغم کے افسانوں کا خاصہ یہ ہے کہ ان کے افسانے آغاز سے اختتام تک قاری پر وحدت تاثر قائم رکھنے میں کامیاب ہیں، جس سے افسانے میں کوئی جھول پیدا نہیں ہوتا اور قاری بھی کسی الجھن میں مبتلا نہیں ہوتا ہے۔ غرض فنی نفاست اور زبان کی لطافت کے ساتھ غزال ضیغم کے افسانے متاثر کن ہیں۔ غزال ضیغم کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع موجود ہے۔ وہ ایک طرف روایات کا دامن تھامے ہوئی ہیں اور دوسری طرف نئے عہد کے تقاضوں سے بھی بخوبی آشنا ہیں۔ ان کے افسانوں میں روایتی قدروں کی پاسداری، جاگردارانہ نظام کا خاتمہ، تہذیبی و ثقافتی وراثت، شہری اور دیہی زندگی، ہندو مسلم تہذیب، موجودہ مسائل اور حقائق جیسے متنوع موضوعات کی تفصیل ملتی ہے۔ اس حوالے سے ترنم ریاض یوں لکھتی ہیں:

> ''غزال ضیغم ایک افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''ایک ٹکڑا دھوپ کا'' شائع ہو چکا ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش ہے۔ اس عمل میں وہ اپنی پوری تہذیبی اور ثقافتی وراثت اور اقدار کا از سرِ نو جائزہ لے کر اپنے نتائج اخذ کرتی ہیں۔ جانچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے ذہن کا تجسس ان کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔''

(ترنم ریاض، بیسوی صدی میں خواتین کا اردو ادب (مرتبہ)، ساہتیہ اکادمی دہلی 2004، ص331)

غزال ضیغم زندگی کی حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھتی ہیں اوران حقیقتوں کواپنے افسانوں کے ذریعے آشکار بھی کرتی ہیں۔ان کے افسانے سماج کے ان تلخ حقائق کا انکشاف کرتے ہیں جو آئے روز ہمارے معاشرے میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔عورتوں کی زبوحالی،ان پر روا ظلم و ستم،حق تلفی،جبر وتشدد اس تلخ حقیقت کی ایک واضح مثال ہے اوران کے تانیثی شعور کا ثبوت بھی۔گویا غزال ضیغم کے افسانوں میں دیگر موضوعات کے علاوہ تانیثی ونسائی پہلو بھی اپنے گہرے رنگ کے ساتھ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ان کے افسانوں میں جگہ جگہ تانیثی فکر وسوچ کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔افسانوی مجموعہ''ایک ٹکڑا دھوپ کا'' کے افسانے ان کی اس خاص فکر وسوچ کے غماز ہیں۔

غزال ضیغم نے صنفِ نسواں کے مختلف طبقوں کی تصویر کشی بڑے موثر انداز میں کی ہے۔ان کے یہاں ایک جانب وہ خواتین ہیں جو اپنے بنیادی حقوق سے باخبر ہیں اوران کی حصولیابی کے لیے جدوجہد بھی کررہی ہیں،جو مرداساس معاشرے کی برائیوں اوراستحصال کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرتی ہیں اوراپنے تشخص،خودمکتفی،خودمختاری نیز بہتر مستقبل کے لیے کوشاں بھی ہیں۔دوسری جانب وہ عورت جو اپنے حقوق کی پامالی،پسماندگی،بےعزتی،محکومیت،ظلم و جبر اور سماج کے سفاک اور بے رحم رویے کو اپنا مقدر سمجھتی ہے یا اگر یوں کہا جائے کہ اسے ایسا سمجھنے پر مجبور کیا گیا تو بے جا نہ ہوگا۔مذکورہ مضمون میں موصوفہ کے متذکرہ افسانوی مجموعے''ایک ٹکڑا دھوپ کا''میں شامل افسانوں میں مصنفہ کے نسائی اور تانیثی شعور کو بارز کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

عورت کو زندگی کے مختلف پڑاؤ پر کچھ نہایت اہم فیصلے لینے پڑتے ہیں جو اس کی ذاتی زندگی کے متعلق ہوتے ہیں،جس میں ایک اہم فیصلہ رشتۂ ازدواج ہے مگر افسوس پدرسری سماج نے عورت کو اس حق سے بھی محروم رکھا ہے۔عورت کی رضامندی اوراس کی خواہش کے خلاف اسے رشتۂ ازدواج میں باندھنا معاشرے کا رواج بن گیا ہے۔غرض عورت پدرانہ سماج کے بنائے گئے اصول وضوابط کی غلامی میں اس قدر جکڑی ہوئی ہے کہ وہ ذاتی زندگی کے فیصلے لینے سے بھی قاصر ہے۔عورت کے تئیں سماج کے اس سفاکانہ برتاؤ کو غزال ضیغم نے اپنے افسانے''سوریہ ونشی چندر ونشی''میں بےنقاب کیا ہے۔مثال ملاحظہ ہو:

''فوراً گھر چلو اماں جانی سخت بیمار ہے۔وہ روتی ہوئی گھر کے لیے چل پڑی۔یکے سے اترتے ہی اس کے کانوں میں شادیانوں کے بول پڑے جنھیں میراثنیں روایتی انداز میں دوہرا رہی تھیں۔گھر کی رونق باہر سے ہی اعلان کررہی تھی کہ کسی کی شادی کا ہنگامہ ہے۔

کس کی شادی کا انتظام ہورہا ہے۔؟ اس نے حیرت سے پوچھا

''آپ کی''اقبال بھیا بڑی کمینگی سے مسکرائے۔

مجھ سے پوچھے بغیر؟ آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟

-------کہ اماں جانی------؟ غصہ اور رنج سے اس کا حلق خشک ہوگیا،آواز پھٹ سی گئی۔

اگر میں سچ بولتا تو کیا وکیلنی صاحبہ تشریف لاتیں؟انھوں نے کلیجے میں برچھی کی انی لگا دی۔اس نے غصے سے پیر پٹخ ڈالے۔سب نے اس کو نرغے میں لے لیا۔روتے روتے اس کو اپنی بےبسی پر ہنسی آنے لگی۔''

(غزال ضیغم،ایک ٹکڑا دھوپ کا،لکھنؤ،آفیسرس ہاسٹل،میرابھائی مارگ 2000،ص 21)

محوالہ اقتباس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس قدر طبقہ اناث کے حقوق کی پامالی ہورہی ہے۔ہرلڑکی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ساتھی کا انتخاب کرے،نیز شادی کا فیصلہ بھی اس کی رضامندی سے لیا جائے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔مذکورہ مجموعے میں شامل ایک اور افسانہ''مشت خاک''میں غزال ضیغم نے معاشرے میں پنپتے ہوئے اس ناسور کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے منفی اثرات عورت کو بہت بری طرح متاثر کرتے ہیں۔سماج کی کسی بھی ناانصافی کا اگر کوئی آسان ہدف ہے تو وہ عورت ہے۔ہمارے معاشرے میں آج بھی کہیں کہیں فرسودہ رسم و رواج قائم ہے۔کمسنی کی شادی انہیں کہنہ روایات کی ایک کڑی ہے۔کم عمری کی شادی سے جہاں لڑکیاں ذہنی وجسمانی اذیت،گھریلو تشدد اور مختلف امراضِ نسواں جیسے مسائل کا شکار ہوتی ہیں تو وہیں تعلیم کے بنیادی حق سے بھی محروم ہوجاتی ہیں۔سماج میں رائج اس بدعت اور ناسور کو غزال ضیغم نے حقیقت پسندانہ انداز میں یوں زیر بحث لاتی ہیں:

''پھلوا ہے چھوا۔گوری لوہار کی بیٹی۔بچپن میں ایک بوڑھے سے بات طے ہوگئی۔جب بارہ کی ہوگئی تو گونا ہوگیا۔جب پونچھی بوڑھے کے گاؤں دیکھا وہاں بڑی بھاوج کا راج ہے۔بوڑھا ان کے پیر دھو کر پیتا ہے۔بھائی اس کا شہر میں پڑا رہتا ہے۔پھلوا اس سے ایک دن بھی نہ پٹی۔بوڑھے نے سمجھایا پھر جوت لات چلایا۔پھلوا بھاگ کھڑی ہوئی۔بڑی دوڑ دھوپ کی گئی۔سب سر جوڑ کے بیٹھے۔پھلوا کو بلایا گیا

۔ پھلوا منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ سب سمجھاتے رہے۔ اونچ نیچ بتائی گئی۔ زبردستی بھیج دینے کی بات بھی ہوئی۔

''ہم کنواں میں ڈوب جاب مُل ہواں نہ جاب'' پھلوا کی موٹی موٹی آنکھوں سے آنسوں ڈبڈبا آئے۔ ہاتھ میں دبی کپڑے کی گڑیا نیچے گر پڑی۔'' (ایضاً، ص107)

ہمارے معاشرے میں اکثر لوگ بیٹیوں کے بارے میں اس طرح کا گمان رکھتے ہیں کہ بیٹیاں بوجھ ہیں جتنی جلدی اتر جائے اچھا ہے۔ اس طرح کی تنگ ذہنیت رکھنے والے لوگ بیٹیوں کے بوجھ سے خود کو فارغ کرنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھتے ہیں۔ سماج کے اس قدامت پسند سوچ کی تصویر کشی کرتے ہوئے غزال ضیغم اسی افسانے میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

''گوری لوہارنے دوہائی دی ''سرکار ہم غریب منی (آدمی) ہیں کہاں سے کھلائیں گے عمر بھر۔ بٹیا راجا مہاراجہ نہ رکھ پائے ہم کہاں رکھ پائیں گے۔'' (ایضاً، ص107)

غزال ضیغم اپنے افسانوں کے ذریعے نہ صرف عورت کا استحصال، کسمپرسی، ظلم وستم اور ان کی ابتر صورت حال کو اجاگر کرتی ہیں بلکہ عورت کو اس استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر آمادہ بھی کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی عورت اگر استحصال کا نشانہ بنتی ہے لیکن باغی بن کر اس کا مقابلہ بھی کرتی ہوئی نظر آتی ہے، جس کی مثال افسانہ ''سوریہ ونشی چندر ونشی'' کے مرکزی کردار روحی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جی نہیں، شادی مجھے کرنی ہے، فیصلہ میں خود کروں گی''

'' میں آپ کی زمین کا قطعہ نہیں ہوں کہ جس کو چاہے آپ دے دیجئے۔ اکیس سال کی لڑکی ہوں۔ قانونی حق ہے میرے پاس بالغ ہونے کا۔'' (ایضاً، ص22)

مذکورہ افسانے میں ایک اور جگہ احتجاج کا شور سنائی دیتا ہے جہاں روحی قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گھر والوں کی اجازت نہ ملنے پر ان کے ساتھ بحث کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

پورا خاندان قانون پڑھنے کے خلاف۔ ''یہ بھلا لڑکیوں کے پڑھنے کی کوئی چیز ہے۔؟'' بڑے چچا چیخے۔

''بڑے چچا یہ چیز نہیں ہے کوئی علم ہے اور علم حاصل کرنا میرا حق ہے۔'' اس نے بے خوف ہو کر کہا۔

''حق''۔۔۔۔۔۔؟ یہ ابھی سے حق کی باتیں کرنے لگیں۔ جانتی بھی ہو لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہوتا۔'' اقبال بھیا بگڑے۔

'' یہ میں کیسے مان لوں کہ لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ یہی جاننے کے لیے تو میں قانون پڑھوں گی۔''

(ایضاً، ص19-18)

اسی طرح غزال ضیغم نے افسانہ ''مشتِ خاک'' کی پھلوا کے ذریعے عورت کی خود مختاری اور خود اعتمادی کی مکمل تصویر کھینچی ہے۔ سرکار کی طرف سے عورتوں کو تیس فیصد ریزرویشن ملنے پر بجن بھیا گاؤں کے دیگر مردوں کے ساتھ ایک معمولی سی لڑکی پھلوا کو الیکشن میں کھڑا ہونے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ وہ سیٹ صرف عورت کے لیے مختص تھی اسی لیے بجن بھیا پھلوا کو نام کا پردھان بنا کر خود پردھانی کرنا چاہتا تھا۔ شروع میں پھلوا اس ذمہ داری کے لیے خود کو اہل نہیں سمجھتی تھی لیکن الیکشن جیت جانے کے بعد اسے ایک خاص شناخت مل جاتی ہے۔ اختیارت مل جانے پر وہ خود کو برتر اور مضبوط محسوس کرنے لگتی ہے اور گاؤں کے ان ہی مردوں کو منہ توڑ جواب دیتی ہے جنہوں نے اپنے مفاد کے لیے اس کا استعمال کرنا چاہا تھا۔ مثال ملاحظہ فرمائیں:

''اے پھلوا باہر نکل کر دیکھ بجن بھیا جی آئے ہیں۔ سلام مار''

بجن بھیا کے مصاحب نے ہانک لگائی۔

پھلوا اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی سے باہر نکلی۔ چھپر میں کھڑے مصاحب نے ہار بڑھایا۔ ہار لے کر اس نے بنی بھینس کی ناند میں ڈال دیا۔ مصاحب کو گورا۔

''اب ہم پہلے والی پھلوا نہیں بَن جی کو جیسے چاہو پکار لو۔ جانو کہ نہیں۔؟ نا ہی ہم تمھرے ہکائے پہ ہکے چلے والے جناور ہن۔ اب ہم کو پردھان کہہ کر پکارو جانے کہ ناہیں؟'' (ایضاً، ص109)

موجودہ دور کی عورت اگر چہ شعوری طور پر بیدار ہو چکی ہے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے اور مستقبل کو سنوارنے میں منہمک ہے لیکن اس کے استحصال میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ عورت اپنے اوپر ہو رہے ہر ظلم وستم کو برداشت کر سکتی ہے لیکن شوہر کی بے قدری، لاپروائی اور بدکرداری کو ہرگز نہیں سہہ سکتی ہے۔ مردوں کے اس غلط رویے کی وجہ سے نہ جانے کتنی جوان لڑکیوں کی زندگی اور خاندان برباد ہو گئے ہیں۔ غزال ضیغم اپنے افسانے ''نیک پروین'' میں مرد ذات کی اس بے حیائی اور بدکرداری پر گہرا طنز کرنے کے ساتھ ساتھ اس مشرقی عورت کو بھی سامنے لاتی ہیں جو اپنے نسائی جذبے سے مجبور ہو کر صبر وتحمل کا دامن تھام لیتی ہے۔ مذکورہ افسانے کی کنیز فاطمہ کے شوہر شادی کے بعد بھی غیر محرم لڑکیوں کے ساتھ عیاشی کرتا

پھرتا ہے۔روز آفس کی کوئی نہ کوئی معمولی ملازمہ اس کی عیاش نظروں کا نشانہ بنتی ہے، لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گھر آ کر ان لڑکیوں کی تعریفیں اپنی بیوی کے سامنے بڑے فخریہ انداز میں کرتا ہے۔غزال ضیغم مرد کے اس سفاکانہ اور بے رحم رویے کو یوں مترشح کرتی ہیں:

''وہ موڈ میں ہوتا تو مزے لے لے کر سناتا۔۔۔۔۔
''وہ قلمی آم کی طرح شیریں ہے تو وہ تخمی آم کی طرح ترش
وہ میک ڈونل کا برگر ہے تو دوسری پزا جو ہی دیسی مزا ہے
۔۔۔۔۔اور شوبھا سرسوں کے ساگ جیسی''

(ایضاً،ص65)

غزال ضیغم کنیز فاطمہ کے ذریعے ہمارے معاشرے کی ان عورتوں کی عکاسی کرتی ہیں جو اپنی ازدواجی زندگی کی محرومیوں اور الجھنوں کا شکار ہوتی ہیں اور ساتھ ہی اس روایتی سوچ کو بھی سامنے لاتی ہیں جو عورت کو مرد کی زیادتیاں برداشت کرنے کا درس دیتی ہے۔ مذکورہ افسانے میں بھی کنیز فاطمہ اپنے شوہر کے ہر ظلم وستم کو سہہ کر اپنی ازدواجی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرتی ہے لیکن آخر کار ناکام ہی رہتی ہے۔گویا غزال ضیغم کنیز فاطمہ کے ذریعے اس فرسودہ سوچ کی عکاسی کرتی ہیں جس نے ازل سے ہی عورت کو نفسیاتی طور پر جکڑا ہوا ہے۔مثال ملاحظہ ہو:

''عورت کو مرد کی زیادتیوں پر خاموش رہنا چاہیے۔یہی نیک عورت کا چلن ہے اپنے شوہر کی برائی کرنے والی عورت سماج میں رسوا ہوتی ہے۔شوہر کی نظروں میں گرتی ہے اور عاقبت میں بھی کوئی جنت کا دروازہ نہیں کھلتا۔''

(ایضاً،ص56)

عہد حاضر میں جہاں عورت ابھی بھی مختلف مسائل سے جوجھ رہی ہے وہیں کچھ عورتیں ایسی بھی ہیں جو خود مختار اور خود کفیل ہیں، جو مرد کے سہارے کے بغیر جینے کے لیے تیار ہیں۔مصنفہ کے افسانوں میں عورت سے ہمدردی کا جذبہ بالکل عیاں ہے۔وہ ہر صورت عورت کو خود کفیل اور بااعتماد دیکھنا چاہتی ہیں۔افسانہ''بے گھر کا دروازہ''میں مصنفہ اسی جذبے کی تصویر کشی یوں کرتی ہیں:

''پڑھائی ختم کر وہ پاپا سے ملنے گئی تھی۔۔۔۔۔اس نے پاپا سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔''میں نے شہر میں انٹر کالج کی نوکری تلاش کر لی ہے، ورکنگ وومن ہاسٹل بھی جوائن کر لیا ہے۔''

''اچھا''۔۔۔۔۔پاپا نے مان لیا تھا۔

لیکن بڑے بھیا جو خاندان کی ناک تھے، چپ کیسے بیٹھتے۔

''ارے یہ کون سا طریقہ ہوا۔ہمارے خاندان کی لڑکی اور دو ٹکے کی نوکری۔۔۔۔''

پہلی مرتبہ وہ بڑے بھیا سے بولی تھی۔''میرے بارے میں اس گھر میں کسی کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔میں اپنی زندگی اپنی طرح جینا چاہتی ہوں۔''یہ کہہ کر وہ جھٹکے سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔''(ایضاً،ص38-39)

دراصل غزال ضیغم سماج کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتی ہیں کہ اب عورت مردوں کے رحم وکرم کی محتاج نہیں ہے بلکہ وہ تعلیم اور ترقی کی راہوں پر آگے بڑھ رہی ہے اور اپنی زندگی کی سمت و رفتار طے کرنے کی قوت اور صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

الغرض غزال ضیغم کے افسانوں کے مطالعے سے ان کے تانیثی فکر کا پرتو نظر آتا ہے۔اگر چہ سماج کے متنوع مسائل کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے تاہم طبقہ اناث اور اس سے جڑے مسائل ان کی ترجیحات میں شامل ہیں۔انھوں نے اس بات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ عورت اگر ہمت اور عزم سے بھرپور ہو تو وہ ہر ظلم وستم اور سماج کی بے جا پابندیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتی ہے۔انھوں نے مرد اساس معاشرے کی ان تمام برائیوں اور کڑوی سچائیوں پر کاری ضرب لگائی ہے جس کی وجہ سے عورت کمزور، محکوم اور مظلوم رہی ہے اور اس کی واضح مثالیں ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔وہ اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرے کی ہر عورت کو مردانہ بالا دستی اور سماج کے ظلم و جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔دراصل وہ اس بات کی متمنی ہیں کہ عورت تعلیم حاصل کرے، خود کفیل و خود مختار بنے اور سماج میں باعزت طریقے سے اپنی زندگی گزارے۔

□□□

Rukaya Maqsood
Research Scholar
University of Kashmir
Hazratbal
Srinagar-190006 (J & K)
Mob: 8082476525
lonerukaya92@gmail.com

شگفتہ جہاں

سرزمینِ بنگالہ کا ایک اہم تاریخی ناول ’تماشائے اہلِ کرم‘

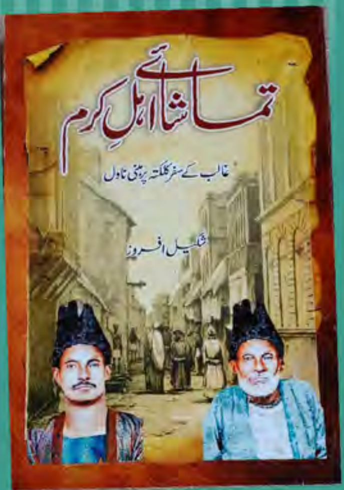

ناول نگاری زندگی کو اس کی تمام تر وسعتوں کے ساتھ کاغذ میں اتارنے کا فن ہے اور بات جب تاریخی ناول کی ہو تو مصنف کی ذمہ داریاں دوہری ہو جاتی ہیں کیونکہ اس میں حقیقت کو افسانے کا رنگ دے کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ دلچسپی بھی قائم رہے اور تاریخ بھی مجروح نہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ اردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کے میدان میں بہت کم فنکار کامیاب نظر آتے ہیں۔ بیشتر ناول نگاروں اور ناقدین نے بھی تاریخی ناول کو ناول نگاری کے جملہ اقسام میں سب سے اہم اور مشکل ترین قرار دیا ہے۔ سرزمین بنگالہ میں اردو ناول نگاری کی روایت پر نظر ڈالی جائے تو تاریخی ناول کے سلسلے میں پہلا نام فضل احمد کریم فضلی کا نظر آتا ہے۔ 1957 میں شائع ہونے والا ان کا ناول ’خون جگر ہونے تک‘ ، قحط بنگال کے موضوع پر اردو کا ایک بہترین تاریخی ناول کہلانے کا حقدار ہے۔ دوسرا نام جان عالم سیف کا ہے۔ انھوں نے ’آخری شکست‘ (1960) اور ’روپ متی‘ (1961) جیسے دو تاریخی ناول اردو ادب کو دیے ہیں۔ کئی دہائیاں گزر جانے کے بعد 2022 میں شکیل افروز کا ناول ’تماشائے اہلِ کرم‘ کے نام سے منظر عام پر آیا جو آفتابِ سخن مرزا اسداللہ خاں غالب کے سفر کلکتہ پر مبنی ہے۔ یوں تو غالب کے سفر کلکتہ کا ذکر ہمیں کئی تحقیقی و تنقیدی کتب و مضامین میں ملتا ہے، خود مصنف کی کتاب ’غالب کلکتہ میں‘ کے عنوان سے 2009 (پہلا ایڈیشن) شائع ہوئی جس میں اہم تاریخی ماخذوں اور استدلال کی روشنی سے یادگار سفر کے تاریک گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے لیکن ان تمام کتب میں ’تماشائے اہلِ کرم‘ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ پنشن کے سلسلے میں غالب کے سفر کلکتہ جیسے اہم لیکن خشک موضوع کو شکیل افروز نے فکشن کی چاشنی میں ڈبو کر دلچسپ اور پرلطف بنا کر پیش کیا ہے۔ اس سے قبل قاضی عبدالستار نے اپنے ناول ’غالب‘ میں مرزا غالب کے توسط سے ان کے عہد کو ابھارا ہے جسے غالب کے سلسلے میں نیم سوانحی ناول کہا جا سکتا ہے۔ گرچہ ’تماشائے اہلِ کرم‘ میں مصنف نے غالب کی پوری زندگی کو موضوع نہیں بنایا بلکہ صرف پنشن کے معاملات اور اس سلسلے میں سفر شہر نشاط کی روداد بیان کی ہے لیکن اس خوش اسلوبی سے اسے ناول کے قالب میں ڈھالا ہے کہ نہ صرف یادگار سفر بلکہ مرزا غالب کی پوری شخصیت کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بقول ظہیر انور:

”غالب کے سفر کلکتہ پر محیط اس تحریر کو شکیل افروز نے تاریخی ناول کہا ہے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ پنشن کی خاطر مرزا غالب کے اہم سفر کی روداد کو نوجوان مصنف نے کس قدر روانی سے

افسانوی رنگ میں ڈھالا ہے۔ اس طرح کا تاریخی/سوانحی بیانیہ بنگال کی سرزمین پر شاید ہی لکھا گیا ہو۔ غالب کے اس تجرباتی سفر کی روداد کے تمام پہلو یہاں جلوہ فگن ہیں۔''

(تماشائے اہلِ کرم، شکیل افروز، کلکتہ، 2022، بیک کور)

پنشن کی بازیافت مرزا غالب کی زندگی کا ایک اہم مسئلہ رہا جس سے وہ سنِ شعور تا مرگ جوجھتے رہے۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ مرزا غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ راجہ بختاور سنگھ کی فوج میں ملازم تھے۔ والد کی شہادت کے بعد چچا نصراللہ بیگ بھی شہید ہو گئے تو برٹش سرکار نے ان دونوں شہدا کے کنبے کے لیے دس ہزار روپے سالانہ پنشن مقرر کی۔ لوہارو کے نواب احمد بخش جو غالب کے چچا کے خسر اور پنشن کی تقسیم کے ذمہ دار تھے، نے ذاتی بغض کے سبب لارڈ لیک کے اصل حکم نامے کو غائب کر کے اس کی جگہ جعلی خط تیار کیا جس میں پنشن کی رقم کے ہندسہ کو بدل کر پانچ ہزار کر دیا اور رشوت خور ملازمین کے توسط سے اس جعلی خط کو ان کے فائل کے ان فارسی کاغذات کے درمیان رکھوا دیا جو یومیہ دستخط کے لیے جاتے تھے۔ نیز اپنے ایک ملازم خواجہ حاجی کو بھی اس پنشن میں ساجھے دار بنا دیا جس کا نصراللہ بیگ کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح پنشن کا ایک بڑا حصہ خواجہ حاجی لے جاتا اور غالب کے خاندان والوں کا گزر بسر مشکل ہو گیا تو وہ قرض کے دلدل میں دھنستے چلے گئے نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ اجدادی سامان کو بھی فروخت کرنا پڑا۔

مرزا غالب نے جب ہوش سنبھالا تو اس بدعنوانی پر مسلسل احتجاج اور اپنے حصے کی پوری رقم کا مطالبہ کرتے رہے۔ لیکن دور رخے نواب احمد بخش اپنی لغزشوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہی دلاسہ دیتے رہے کہ حاجی کی موت کے بعد پانچ ہزار کی پوری رقم غالب کے خاندان والوں کو ہی ملے گی۔ ظلم کی انتہا تو یہ ہے کہ خواجہ حاجی کی موت کے بعد وہ رقم اس کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کی جانے لگی۔ آخرکار مرزا غالب نے اپنے حق کے لیے برٹش گورنمنٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان دنوں متحدہ ہندوستان کا ہیڈکوارٹر کلکتہ ہوا کرتا تھا۔ پہلے پہل غالب نے دہلی کے دفتر میں لارڈ لیک کے اصل خط کی نقل کا سراغ لگانے کی کوشش کی مگر نامراد رہیں، پھر انھوں نے اس سلسلے میں ریذیڈنٹ چارلس مٹکاف اور گورنر جنرل لارڈ امہرسٹ سے براہ راست مل کر التجا کرنے کی خاطر بھرت پور اور کانپور کا سفر بھی کیا لیکن ان تک نارسائی کی صورت میں بالآخر درخواست گزاری کے لیے دارالخلافہ کلکتہ کا سفر کیا۔ اس سفر کا آغاز 1827 میں لکھنؤ سے ہوتا ہے اور باندہ، الہ آباد، بنارس، عظیم آباد، مرشد آباد ہوتے ہوئے 20 فروری 1828 کو غالب کلکتہ پہنچتے ہیں۔

ناول کا ایک تہائی حصہ غالب کے دلی سے کلکتہ تک کے سفر پر مبنی ہے جس میں اس یادگار سفر کے تمام پہلوؤں کو مصنف نے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ اس پورے سفر کا نقشہ نہ صرف ہماری آنکھوں کے سامنے رونما ہوتا معلوم ہوتا ہے بلکہ ہم بھی خود کو غالب کے ہمراہ سفر کی صعوبتیں جھیلتے تصور کرنے لگتے ہیں۔ سفر کشتی کا ہو یا بیل گاڑی یا گھوڑے کا یہاں مرزا غالب کی تھکاوٹ ہماری طبیعت کو بھی نڈھال کرتی ہے۔ غالب کا دن کی تمازت سے جھلسنا ہو یا راتوں کو سردی سے ٹھٹھرنا یا بیماری کی نقاہت سے کراہنا، یہ گرم و سرد واقعات اور ناتوانائی ہمارے جسم کو بھی چھوتی محسوس ہوتی ہے۔ مصنف کے قلم کا کمال یہ ہے کہ ہم نہ صرف غالب بلکہ ان کے ہوا سے باتیں کرتے گھوڑے کی تھکن اور سانسوں کے پھولنے کو بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ ناول کے مطالعہ کے دوران ہم غالب کے ساتھ خود کو کبھی بنارس کے گنگا گھاٹ کی سیر کرتے پاتے، کبھی باندہ اور مرشدہ آباد کے نوابین کے محلات اور باغات میں ٹہلتے، تو کبھی کلکتہ کے دریا کنارے اور بازاروں میں گھومتے تصور کرنے لگتے ہیں۔

'تماشائے اہلِ کرم' کو اہم بنانے والی شئے اس کا اسلوب ہے۔ یہ اسلوب ہی ہے جو زیرِ نظر کتاب کو ناول کے زمرے میں لا کھڑا کرتی ہے ورنہ یہ محض ایک سوانح یا سفرنامہ یا ایک تاریخی کتاب بن کر رہ جاتی۔ شکیل افروز نے مرزا غالب کی زندگی کے اس خشک پہلو اور سادہ تصویر کو اپنے لطیف، دلکش و اشاراتی اندازِ بیان سے رنگین بنا کر پیش کیا ہے۔ ناول کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو کہانی کہنے کا ڈھب آتا ہے۔ ناول کی زبان کہیں سادہ و شستہ تو کہیں علامتی و اشاراتی ہونے کے باوجود دلکش اور رواں ہے۔ تشبیہات کا برمحل استعمال اور اشاراتی زبان اوّل تا آخر ناول میں دلچسپی کا ضامن ہے۔ ملاحظہ کریں:

''لہریں متواتر ساحلوں سے اپنا سینہ ٹکرا رہی تھیں۔ برف سی ہوائیں پانی کے بدن کو چوم رہی تھیں۔ نیلے آسمان پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھی، شیر، بکری کی مشابہت بنے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ سورج نکل چکا تھا۔ افق پر شفق کی لالی مٹتی جا رہی تھی۔ دریا کنارے موجود بت کدوں میں ناقوس بج رہے تھے۔ داسیوں کے گنگنانے کی آوازیں غالب کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔'' (ایضاً ص۔59)

''ذرا رات ہوئی تو چھت پر نکل آئے۔ ویسے تو آسمان پر پورا چاند روشن تھا لیکن موسم میں خنکی تھی۔ ہوا مشرق سے چل رہی

مالی بدعنوانی کے سبب ریزیڈنٹ کے دفتر سے معزول ہو جانے پر پورا آفس بے ترتیب ہو جاتا ہے اور غالب کے مقدمے کے سلسلے میں اہم کاغذات گم ہو جاتے ہیں۔ یہ غالب ہی ہیں جو مسافت اور تکنیکی لغزشوں کی چکی میں پس کر رہ گئے لیکن امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ دہلی پہنچ کر بھی وہ اپنے حق کے لیے درخواست پر درخواست جمع کرتے رہے اور جواز و کاغذات فراہم کرتے رہے مگر فیصلہ ان کے خلاف ہی رہا۔ حتیٰ کہ ملکہ عالیہ کی خدمت میں بھی اپیل کی لیکن وہاں بھی انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ غالب کی شکست کا سبب دہلی اور کلکتہ کی مسافت نہیں بلکہ سسٹم کی بدعنوانی تھی۔ ناول میں مصنف نے جسے یوں بیان کیا ہے ملاحظہ کریں:

''غالب کاغذات سے نہیں، مجہول تانا شاہی کے سسٹم سے ہار گئے تھے اور یہ مغربی نظام نہ جانے کتنے غالبوں کو آج بھی شکست پر شکست دے رہا ہے۔ !!!'' (ایضاً،ص۔219)

ان جملوں پر ہی ناول ختم ہو جاتا ہے۔ مختصر لیکن جامع الفاظ میں اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے سلسلے میں یہاں شکیل افروز بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔

غالب کا سفرِ کلکتہ جو 1827 سے شروع ہوا اور 1829 میں دہلی کے لیے واپسی پر تمام ہوتا ہے۔ تقریباً تین سال کی اس مسافت نے مرزا غالب کو مالی نفع نہ سہی لیکن وہ نایاب تجربہ دیا جو غم و نشاط دونوں سے عبارت ہے۔ یہی سبب ہے کہ غالب نے کہا ہے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اگرچہ کلی پنشن کی حصولیابی کے سلسلے میں غالب کا سفرِ کلکتہ ناکام رہا لیکن بعض اعتبار سے بہت اہم ثابت ہوا۔ کلکتہ نے ایک طرف مرزا غالب کو مرزا احمد بیگ طپاں، ابوالقاسم خان، سراج الدین احمد، میر احمد، دیوان محمد علی جیسے یار و مددگار اور سائیس جیسا خدمت گار دیا تو دوسری طرف دیا مرزا افضل بیگ کی سازشوں کا وار۔ کبھی مشاعروں میں اپنی ادبی حیثیت کا لوہا منوایا تو کبھی رقیبوں نے تنقیص کا نشتر چبھایا۔ کہیں ڈومنی کی یاد نے ٹیس پہنچائی تو کہیں بنارس کی دیوداسی نے ایک تیر اور چلایا۔ ایک طرف 'آتشی نامہ' سے قرطاس کو جھلسایا تو دوسری طرف 'گلِ رعنا' جیسا گلدستہ سجایا۔ مرزا غالب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر وہ مجرد ہوتے اور ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتے تو کلکتے کے ہی ہو کر رہ جاتے۔ کلکتے کے سلسلے میں مرزا غالب کے خیالات کو ناول میں یوں بیان کیا گیا ہے ملاحظہ کریں:

''ایسا لگتا ہے کہ کلکتے میں یہ میری آخری عید ہے۔ میں نے راست کلکتہ آکر غلطی کی ہے۔ مجھے اپنی عرضی دہلی میں ہی دینی تھی۔ تاہم مجھے اس کا ملال نہیں۔ اس شہر سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہاں کے سفر آوارگی نے مجھے شہرت دی ہے۔ میں نے یہاں آکر اخبار اور دخانی جہاز دیکھے، بندرگاہ دیکھی۔ دہلی کے مقابلے یہ جدید شہر ہے۔ کلکتہ ایک ایسا دیار ہے جہاں ہر نوع کے ساز و سامان کی فراوانی ہے۔ خوش نصیبی کے سوا اس کے بازاروں میں ہر شئے بہ افراط اور بکثرت ملتی ہے۔'' (ایضاً،ص۔200)

'تماشائے اہلِ کرم' وہ آئینہ ہے جس میں غالب کا سلسلۂ نسب ہو یا امراؤ بیگم کی وفا شعاری، ڈومنی اور دیوداسی سے عشق ہو یا پنشن کی خاطر جد و جہد، بنارس کا گنگا گھاٹ ہو یا کلکتہ کے بازاروں کا حال، بنگالن کا گیت گانا ہو یا غالب کا بے یار و مددگار درگاہ پر آنسو بہانا، ادبی معرکہ آرائیاں ہوں یا تہواروں کا جشن، مرزا غالب اور ان کے عہد کے ہر پہلو کا عکس یہاں صاف نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر ناول کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں انیسویں صدی کے نصف اول کا ہندوستان اور ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے چراغ جا بجا روشن نظر آتے ہیں۔ ناول میں گلی ڈنڈا، پتنگ بازی، چور سپاہی کا کھیل، غریب گاؤں والوں کا بحیثیت مہمان مسافروں کی تواضع، ڈومنی کا رقص، بنگالن کا گانا، طرحی مشاعروں کی روداد، مولا علی شاہؒ کی درگاہ پر ہندو مسلم عقیدت مندوں کا ہجوم، کالی مندر میں بکرے اور بھینس کی بلی، گھاٹ پر ہندو مردوں اور عورتوں کا علیحدہ اشنان خصوصاً قریب المرگ لوگوں کے اشنان کے وقت خاص پوجا کا اہتمام، عید پر مہمانوں کا غالب کے گھر عید ملن کو آنا، عید کا مخصوص دسترخوان اور مرزا کی مہمان نوازی وغیرہ ان سب میں ہندوستانی تہذیب و طرزِ معاشرت کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں جو ہندوستان کی رنگا رنگ گنگا جمنی تہذیب کی جلوہ نمائی کرتے ہیں۔ ناول سے دیوالی کے جشن کا یہ منظر ملاحظہ کریں جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ ہے:

''شملہ بازار میں ہندو مسلم کی ملی جلی آبادی تھی۔ تہوار لوگ اپنے اپنے گھروں میں مناتے تھے لیکن اس کے جشن میں سبھی شریک ہوتے تھے۔ یہ تنوع میں اتحاد کا مظاہرہ تھا۔ کیا ہندو، کیا مسلم، کیا سکھ، کیا عیسائی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے اور فخر سے ہندستانی ہونے کا اظہار کرتے تھے۔

اس دن دیوالی تھی۔ غالب رات کو چھت پر کھڑے ہو کر پورے شملہ بازار کا نظارہ کر رہے تھے۔ ہر چھت پر چھوٹے

مالی بدعنوانی کے سبب ریزیڈنٹ کے دفتر سے معزول ہو جانے پر پورا آفس بے ترتیب ہو جاتا ہے اور غالب کے مقدمے کے سلسلے میں اہم کاغذات گم ہو جاتے ہیں۔ یہ غالب ہی ہیں جو مسافت اور تکنیکی لغزشوں کی چکی میں پس کر رہ گئے لیکن امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ دہلی پہنچ کر بھی وہ اپنے حق کے لیے درخواست پر درخواست جمع کرتے رہے اور جواز و کاغذات فراہم کرتے رہے مگر فیصلہ ان کے خلاف ہی رہا۔ حتیٰ کہ ملکہ عالیہ کی خدمت میں بھی اپیل کی لیکن وہاں بھی انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ غالب کی شکست کا سبب دہلی اور کلکتہ کی مسافت نہیں بلکہ سسٹم کی بدعنوانی تھی۔ ناول میں مصنف نے جسے یوں بیان کیا ہے ملاحظہ کریں:

''غالب کاغذات سے نہیں، مجہول تانا شاہی کے سسٹم سے ہار گئے تھے اور یہ مغربی نظام نہ جانے کتنے غالبوں کو آج بھی شکست پر شکست دے رہا ہے۔ !!!''(ایضاً ص۔219)

ان جملوں پر ہی ناول ختم ہو جاتا ہے۔ مختصر لیکن جامع الفاظ میں اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے سلسلے میں یہاں شکیل افروز بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔

غالب کا سفرِ کلکتہ جو 1827 سے شروع ہوا اور 1829 میں دہلی کے لیے واپسی پر تمام ہوتا ہے۔ تقریباً تین سال کی اس مسافت نے مرزا غالب کو مالی نفع نہ سہی لیکن وہ نایاب تجربہ دیا جو غم ونشاط دونوں سے عبارت ہے۔ یہی سبب ہے کہ غالب نے کہا ہے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اگرچہ کلی پنشن کی حصولیابی کے سلسلے میں غالب کا سفرِ کلکتہ ناکام رہا لیکن بعض اعتبار سے بہت اہم ثابت ہوا۔ کلکتہ نے ایک طرف مرزا غالب کو مرزا احمد بیگ طپاں، ابوالقاسم خان، سراج الدین احمد، میر احمد، دیوان محمد علی جیسے یارومددگار اور سائیس جیسا خدمت گار دیا تو دوسری طرف دیا مرزا افضل بیگ کی سازشوں کا وار۔ کبھی مشاعروں میں اپنی ادبی حیثیت کا لوہا منوایا تو کبھی رقیبوں نے تنقیص کا نشتر چبھایا۔ کہیں ڈومنی کی یاد نے ٹیس پہنچائی تو کہیں بنارس کی دیوداسی نے ایک تیر اور چلایا۔ ایک طرف 'آتشی نامہ' سے قرطاس کو جھلسایا تو دوسری طرف 'گلِ رعنا' جیسا گلدستہ سجایا۔ مرزا غالب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر وہ مجرد ہوتے اور ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتے تو کلکتے کے ہی ہو کر رہ جاتے۔ کلکتے کے سلسلے میں مرزا غالب کے خیالات کو ناول میں یوں بیان کیا گیا ہے ملاحظہ کریں:

''ایسا لگتا ہے کہ کلکتے میں یہ میری آخری عید ہے۔ میں نے راست کلکتہ آکر غلطی کی ہے۔ مجھے اپنی عرضی دہلی میں ہی دینی تھی۔ تاہم مجھے اس کا ملال نہیں۔ اس شہر سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہاں کے سفرِ آوارگی نے مجھے شہرت دی ہے۔ میں نے یہاں آکر اخبار اور دخانی جہاز دیکھے، بندرگاہ دیکھی۔ دہلی کے مقابلے یہ جدید شہر ہے۔ کلکتہ ایک ایسا دیار ہے جہاں ہر نوع کے سازوسامان کی فراوانی ہے۔ خوش نصیبی کے سوا اس کے بازاروں میں ہر شئے بہ افراط اور بکثرت ملتی ہے۔''(ایضاً ص۔200)

'تماشائے اہلِ کرم' وہ آئینہ ہے جس میں غالب کا سلسلۂ نسب ہو یا امراؤ بیگم کی وفا شعاری، ڈومنی اور دیوداسی سے عشق ہو یا پنشن کی خاطر جدوجہد، بنارس کا گنگا گھاٹ ہو یا کلکتہ کے بازاروں کا حال، بنگالن کا گیت گانا ہو یا غالب کا بے یارومددگار درگاہ پر آنسو بہانا، ادبی معرکہ آرائیاں ہوں یا تہواروں کا جشن، مرزا غالب اور ان کے عہد کے ہر پہلو کا عکس یہاں صاف نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر ناول کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں انیسویں صدی کے نصف اول کا ہندوستان اور ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے چراغ جابجا روشن نظر آتے ہیں۔ ناول میں گلی ڈنڈا، پتنگ بازی، چور سپاہی کا کھیل، غریب گاؤں والوں کا بحیثیت مہمان مسافروں کی تواضع، ڈومنی کا رقص، بنگالن کا گانا، طرحی مشاعروں کی روداد، مولا علی شاہؒ کی درگاہ پر ہندو مسلم عقیدت مندوں کا ہجوم، کالی مندر میں بکرے اور بھینس کی بلی، گھاٹ پر ہندو مردوں اور عورتوں کا علیحدہ اشنان خصوصاً قریب المرگ لوگوں کے اشنان کے وقت خاص پوجا کا اہتمام، عید پر مہمانوں کا غالب کے گھر عید ملن کو آنا، عید کا مخصوص دسترخوان اور مرزا کی مہمان نوازی وغیرہ ان سب میں ہندوستانی تہذیب وطرزِ معاشرت کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں جو ہندوستان کی رنگا رنگ گنگا جمنی تہذیب کی جلوہ نمائی کرتے ہیں۔ ناول سے دیوالی کے جشن کا یہ منظر ملاحظہ کریں جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ ہے:

''شملہ بازار میں ہندو مسلم کی ملی جلی آبادی تھی۔ تہوار لوگ اپنے اپنے گھروں میں مناتے تھے لیکن اس کے جشن میں سبھی شریک ہوتے تھے۔ یہ تنوع میں اتحاد کا مظاہرہ تھا۔ کیا ہندو، کیا مسلم، کیا سکھ، کیا عیسائی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے اور فخر سے ہندستانی ہونے کا اظہار کرتے تھے۔

اس دن دیوالی تھی۔ غالب رات کو چھت پر کھڑے ہو کر پورے شملہ بازار کا نظارہ کر رہے تھے۔ ہر چھت پر چھوٹے

بڑے دیئے روشن تھے۔ کہیں قطاروں میں، کہیں بیضاوی، کہیں مدور تو کہیں منتشر۔ بچے پھول جھڑیاں چھوڑ رہے تھے۔ مرد اور عورت بڑی تعداد میں ہاتھوں میں پوجا کے سامان لیے مندر جا رہے تھے۔

غالب نے اپنے ملازم سے کہا ''میاں جلدی بازار جاؤ، درجن بھر دیئے لاؤ۔ پوری حویلی میں چراغاں کردو۔''

تھوڑی دیر بعد ملازم کمہار کے یہاں سے دیئے لے آیا اور ایک ایک کو جلانا شروع کیا۔ غالب نے ان جلتے دیؤں کو چوکھٹ پر، کھڑکی پر، دالان پر، سیڑھی پر اور آخر میں جل چھت پر رکھ دیا اور متبسم ہوئے ''یہی ہمارا ہندستان ہے۔ یہی گنگا جمنی تہذیب ہے۔ تہوار فرقے کا ہوتا ہے لیکن جشن سب کا ہوتا ہے۔ آنے والے دنوں میں اتحاد کا کردار عظیم ہندستان کے لیے بہت اہم ثابت ہوگا۔'' (ایضاً ص۔207،206)

شکیل افروز نے صرف گنگا جمنی تہذیب ہی نہیں بلکہ اینگلو انڈین کلچر کو بھی ناول کے پلاٹ میں بخوبی سمویا ہے۔ اینگلو انڈین کلچر جو تین مشترکہ تہذیب سے عبارت ہے اور انگریزوں کے ہندوستانیوں کے ساتھ ربط وارتباط کا پیش خیمہ ہے۔ ناول سے شہر نشاط میں انگریزوں کے تہوار کرسمس (بڑا دن) کا یہ منظر ملاحظہ کریں جو اسی اینگلو انڈین کلچر کا غماز ہے:

> ''انگریزوں کے علاقے لال دیگھی سے پارک اسٹریٹ تک سجے ہوئے تھے۔ رنگ برنگ کے ملبوسات میں مرد، عورت اور بچوں کے چہرے خوشیوں سے تمتما رہے تھے۔ کلیساؤں کو قرینے سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر سانتا کلاؤز کی بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ان پر بڑی بڑی گھنٹیاں اور بڑے بڑے ستارے بنے ہوئے تھے۔ گرجوں کے اندر فرنگیوں کی آمد ورفت تھی تو باہر مقامی لوگوں کا مجمع تھا۔ انگریز ان لوگوں کو بھی اپنی خوشیوں میں شریک کر لیتے تھے اور سب کو کیک کھلاتے تھے۔''

(ایضاً ص۔195)

الختصر ناول 'تماشائے اہلِ کرم' مرزا غالب کے سلسلے میں تاریخی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تہذیبی دستاویز کا بھی درجہ رکھتا ہے۔

فن پارے میں خوبیوں کے ہمراہ چند تسامحات کا در آنا فطری ہے۔ زیر نظر ناول میں ایک چیز جو جا بجا کھٹکتی ہے وہ انگریزی الفاظ کا بے موقع استعمال ہے۔ مصنف نے بیانیہ میں بک (Book)، فیل (Fail)، بینر (Banner)، کیش (Cash)، سرپرائز (Surprise)، انکوائری (Enquiry) جیسے انگریزی الفاظ کو بھی ناول میں جگہ دی ہے لیکن یہ الفاظ نہ کرداروں کے مزاج ومرتبہ کے مطابق ہیں اور نہ ہی موقع ومحل کے۔ نتیجتاً یہ بے ربط اور تاریخی تسلسل کی راہ میں رخنہ انداز معلوم ہوتے ہیں۔ ناول سے بے ربط الفاظ کا ایک نمونہ ملاحظہ کریں:

> ''سائیس نے مرزا کو گھوڑے پر بیٹھا کر دریا تک پہنچا دیا۔ دریا میں موجود دخانی جہاز دیکھ کر مرزا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
> ''ارے یار! یہ تو بھاپ سے چلنے والے آبی جہاز ہیں۔ کیا غضب کے ہیں! گھڑسواری بھی اس کے سامنے فیل ہے۔ کتنی تیزی سے آتے ہیں اور جاتے ہیں۔''

(ایضاً ص۔73)

یہاں ''ارے یار'' اور ''فیل'' جیسے الفاظ آفتاب سخن مرزا غالب کے مزاج وشخصیت کے مطابق معلوم نہیں ہوتے۔ غالب لاکھ ہمدم وہم نوا سہی لیکن غالب جیسے بلیغ وعظیم شاعر کی زبان کا کھلنڈرا پن یہاں شاق گزرتا ہے۔

الغرض چند لغزشوں سے قطع نظر ناول 'تماشائے اہلِ کرم' اپنے جاذب اسلوب، دلکش منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری، جزئیات نگاری، تاریخی حقائق سے آگہی اور ہندوستانی تہذیب وطرزِ معاشرت کا بہترین مرقع ہونے کے سبب فکر وفن کی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہ اردو کا ایک منفرد ناول کہلانے کا مستحق ہے اور بنگال کے اردو ناول کی تاریخ میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ شکیل افروز کی اس ادبی واجتہادی کاوش کی داد نہ دینا بددیانتی ہوگی۔

□□□

Shagufta Jahan
Ph.D. Research Scholar
Deptt. of Urdu, Calcutta University
5/B Patwar Bagan Lane
Kolkata-700009
Mobile- 9163118292
shagufta037@gmail.com

شاہدہ کوثر

کرشن چندر کے افسانے

کرشن چندر اردو ادب میں کسی بھی تعارف کے محتاج نہیں۔ کرشن چندر کی ابتدائی تعلیم پونچھ کے ضلع مہنڈر میں ہوئی اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ان کے والد پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے وہ ملازمت کے سلسلے میں مہنڈر میں مقیم رہے۔ ان کی زندگی کا ابتدائی دور خطہ پیر پنچال کی سرسبز شاداب وادیوں میں گزرا اس لیے وہ یہاں کے ذرے ذرے سے واقف تھے۔ کرشن چندر نے یہاں کے قبائلی لوگوں کی زندگی، سیاسی وسماجی حالات کو بہت نزدیک سے دیکھا اور اسے محسوس کرنے کے بعد نثری پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی جب بھی خطہ پیر پنچال میں اردو فکشن کا جائزہ لیا جائے گا تو ہمارے سامنے بڑا نام کرشن چندر کا آئے گا۔ ویسے بھی خطہ پیر پنچال اردو ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سرزمین پر کشمیری لال ذاکر اور چراغ حسن حسرت جیسی مایہ ناز شخصیات نے آنکھیں کھولیں کرشن چندر کے افسانوں کی اگر ہم بات کریں تو ریاست جموں وکشمیر ان کے افسانوں میں جا بجا ملتا ہے اگر صرف خطہ پیر پنچال کو ان کے افسانے میں دیکھیں تو یہاں کی خوبصورت پہاڑیوں، وادیوں اور یہاں کے قبائلی لوگوں کا کھان پان، رہن سہن جیسے مختلف اجزا ملتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''گرجن کی ایک شام'' خطہ پیر پنچال کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جہاں کے قبائلیوں کی زندگی وہاں کے بلند وبالا کوہستانو جیسی مضبوط اور محبت وخلوص سے بھرپور ہے۔ گرجن کی سبزہ زار برفیلی پہاڑیاں سیاحت کا مرکز ہیں۔ لیکن عرصہ دراز تک یہ دلکش مقام سیاحوں کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکا۔ لیکن ان دلفریب وادیوں میں قبائل کی جفاکش برجستہ ہونے والی مشقت بھری زندگی بھی سانس لیتی نظر آتی ہے۔ اس افسانے میں کرشن چندر کا التفات خطہ پیر پنچال کے خانہ بدوش لوگ اور ان کی محنت کش زندگی کا عکس دکھایا گیا ہے کیونکہ قبائلی لوگوں کو ہی سب سے زیادہ جبر واختصار کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ انھیں غربت، ناخواندگی اور زندگی کے اکثر شعبوں میں پسماندگی سے ابھی تک نجات نہیں مل سکی اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے بڑی وجہ تعلیمی پسماندگی۔ کیونکہ ان لوگوں کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا یہ گرمیوں میں اپنے مال مویشیوں کے ساتھ خطہ پیر پنچال کے پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے ہیں اور سردیاں شروع ہوتے ہی آبادی والے علاقوں کی طرف رخ کر لیتے ہیں۔ کرشن چندر اپنے افسانے ''گرجن کی ایک شام'' میں ایک طرح سے شہری اور قبائلی لوگوں کا تقابل کرتے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح اونچے برف پوش پہاڑوں اور جنگلوں میں کھلے آسمان تلے اور فطری فضا میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان وادیوں میں بسنے والے قبائلی لوگوں کی تصویرکشی اپنے افسانے ''گرجن کی ایک شام'' میں اس طرح کی ہے:

''گرجن میں زندگی ایک سپنے کی طرح گزرتی ہے۔ اس سپنے میں ریشمیں گھاس کے بے شمار قطعے ہیں۔ ان قطعوں

کے اندر کہیں کہیں تنگ کے درخت ہیں۔ ان تنگ کے درختوں کے نیچے گڈریے اور ان کے ریوڑ رہتے ہیں۔ دن بھر ریوڑ سبزے سے قطعوں میں گھاس چرتے ہیں، کودتے ہیں، ناچتے ہیں، میں میں بابا کرتے ہیں کبھی نا کام رہتے ہیں تو ایک دوسرے کو سینگ مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ گڈریے مینڈھوں کو لڑاتے ہیں شرطیں بدتے ہیں، ہارتے ہیں، جیتتی ہیں۔ الغوزے بجاتے ہیں شکنجہ جھکتے ہیں۔ پھر جب شام ہو جاتی ہے اور مغربی افق کی آخری لال دو دھاری تاریکی میں کم ہونے لگتی ہے تو ریوڑوں کو واپس تنگ کے درختوں سے لے آتے ہیں۔ الاؤ کے ارد گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں کھانے میں دودھ شامل ہوتا ہے اور مکھن اور مکے کی روٹی کبھی نمک یا گڑھ یا نیچے کی بستیوں سے کبھی کبھی پیاز اور مرچیں بھی آ جاتی ہیں۔ ورنہ اکثر دہی دودھ اور مکے کی روٹی، دہی مکھن پنیر گر جن میں ہر چرواہے اور چرواہی کے جسم سے پنیر کی سوندھی سوندھی بو آتی ہے جو اکثر شہری طبیعتوں کو بہت بری معلوم ہوگی۔ پسند اپنی اپنی۔ غازہ اور پاؤڈر اور لپ اسٹک کی جگہ چرواہیاں یہی دودھ مکھن استعمال کرتی ہیں۔''

(''کرشن چندر اور ان کے افسانے'' (ص258)

اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کرشن چندر نے ان لوگوں کی زندگی کا چال چلن، رہن سہن کے سادہ اور فطری انداز کو اپنے افسانے کا مرکز بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں کے پسندیدہ کھان پان کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس خطے کی سب سے پسندیدہ غذا مکے کی روٹی دہی اور لسی ہے یہ تو صرف ایک مثال تھی سچ یہ ہے کہ ان کے کہیں افسانوں میں خطہ پیر پنچال کی دیہاتی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔

اسی طرح کرشن چندر نے اپنے افسانے ''کالو بھنگی'' میں کالو بھنگی کو علامت بنا کر اس خطے میں بسنے والے ایسے طبقے کو موضوع بحث بنایا ہے جو اپنی زندگی میں چھوٹی چھوٹی ضرورتوں سے بھی محروم ہے۔ اس افسانے میں خطہ پیر پنچال کی تہذیب و ثقافت اپنی خوبیوں و خامیوں کے لیے سانس لیتی دکھائی دے رہی ہے کہ کس طرح امیر اور پڑھا لکھا طبقہ نہ جانے کالو بھنگی جیسے کتنے ہی بے بس اور مجبور لوگوں کو ایسی زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے جو جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ کالو بھنگی محرومیوں کا اس قدر شکار تھا کہ اسے کس طرح ادب میں جگہ دی جاسکتی تھی کیونکہ ادب صرف بادشاہوں اور امیر طبقے پر تخلیق ہوتا رہا تھا۔ اس لیے اس کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں گئی افسانے کا یہ اقتباس دیکھیے:

''میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رُک گیا ہے کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جاسکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے، لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی، جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہوسکتا ہے۔'' (''کرشن چندر کے دس بہترین افسانے'' (ص123)

کرشن چندر نے اس کی مجبوری کے علاوہ پرانے جھاڑو اس کے پرانے پھٹے کپڑے اور بدصورت پاؤں کو بھی اس افسانے میں جگہ دے کر مزدور لوگوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ لیکن ان تمام مشکلوں کے بعد بھی کالو بھنگی نے نہ اپنی تہذیب کو چھوڑا اور نہ ہی اپنے کام میں کوئی تبدیلی لائی مگر بدلتے وقت کے ساتھ افسانہ نگار نے سماجی، تہذیبی اور معاشرے میں اس منظر کی اہمیت کو محسوس کر کے اس طبقے کے لوگوں کو وراثت میں ملی ہوئی ناامیدی کو امید کی کرن میں تبدیل کیا۔

''آنگی''، کرشن چندر کے افسانوں میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے خود بھی کرشن چندر کا یہ پسندیدہ افسانہ ہے ''آنگی'' افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ افسانے کے عنوان سے لیا گیا ہے جوان پڑھ اور بے حد معصوم ہے۔ آنگی کا پیشہ جنگل میں اپنے مویشوں کو چرانا ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنے مال مویشی کو لے کر جنگل کی طرف نکل جاتی ہے۔ اور دن بھر ان کی بے جا شرارتوں سے تنگ، چہرے پہ پسینہ اور گال غصہ کی وجہ سے سُرخ ہو جاتے ہیں اور اسی حالت میں اس کی ملاقات ایک ایسے مسافر سے ہوتی ہے جو شہری زندگی سے تنگ آ کر سکون کے کچھ پل گزارنے جنگل کے راستے گاؤں نکل جاتا ہے۔ وہ اس کی سادگی اور معصومیت سے متاثر ہو کر اس سے دوستی کر لیتا ہے۔ کرشن چندر نے اس افسانے میں دو لوگوں کی محبت کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا ان دو کرداروں کو انہی خوبصورت وادیوں میں دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ ان کرداروں کی زبان، چال چلن وغیرہ سب کچھ اسی خطے کے لوگوں جیسا معلوم ہوتا ہے۔ افسانہ خطہ پیر پنچال کے پس منظر کو بڑے فکری انداز سے پیش کرتا ہے افسانہ کا اقتباس دیکھیے۔

''نیلتی اور بلی، دو خوبصورت بچھریاں واپس گھر جانے کی خوشی میں ہرن کی طرح قلانچیں بھر رہی تھیں اور بچاری چرواہی کو انہیں ریوڑ کے ساتھ رکھنے میں بہت دقت محسوس ہو رہی تھی۔ نیلتی کبھی بھیڑوں کے گلے میں گھس جاتی اور انھیں اتنا

پریشان کرتی کہ وہ بابے، بابے کرتی ہوئی تتر بتر ہو جاتی اور سارے ریوڑ کے نظام کو جو کسی تربیت یافتہ فوج کی باقاعدگی کے ساتھ چل رہا تھا توڑ دیتی لابی ناچتی کودتی ہوئی بکریوں کے قریب جاتی اور انھیں دھکے مار مار کر آس پاس سے ٹیلوں پر چڑھا دیتی۔ بڑی بوڑھی گائیں اور بھینسیں نہایت اطمینان سے اور قدرے حقارت سے یہ منظر دیکھتی جاتی تھیں"

("کرشن چندر کے بہترین افسانے" (ص63)

کرشن چندر نے "آنگی" افسانے میں جس طرح یہاں کے الفاظ استعمال کیے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ جیسے درختوں میں منو اور تنگ کا استعمال جا بجا ملتا ہے۔ منو پیر پنچال میں کافی مشہور ہے اور اس کے استعمال کی وجہ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا اور خاص کر بچپن اور لڑکپن کا حصہ دیہاتی زندگی میں گزارا شاید اسی لیے انھوں نے اپنے افسانوں میں خطہ پیر پنچال کی ثقافت اور یہاں کے ہر رسم ورواج کو بیان کیا ہے۔

اسی طرح کرشن چندر نے اپنے افسانے "بچپن" کو نہایت ہی متاثر کن انداز میں بیان کیا ہے۔ آج کے اس دور میں کھیل کود کے لیے ہر طرح کا ساز وسامان میسر ہے۔ لیکن بچپن میں گاؤں کی وہ تہذیب انسان کو بے حد متاثر کرنے والی تھی جیسے رفیع کا بچپن کبھی تیتریوں کے پروں سے کھیلتے ہوئے تو کبھی باغ میں لگے رنگ برنگے پھلوں کو دیکھ کر کاٹنے لگتا ہے۔ افسانہ بچپن کی پوری کہانی دو کرداروں کا مرکز بنتی ہے کہ کس طرح نیلا اور رفیع کے دلوں میں کھیلتے کھیلتے پیار پروان چڑھنے لگتا ہے اور پھر جب رفیع کا وہاں سے جانے کا وقت آتا ہے تو دونوں اپنے اپنے پیار کی نشانیاں ایک دوسرے کو دے کر اس رشتے کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھتے ہیں۔ مگر تیرہ سال بعد جب دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو رفیع کے دل میں بچپن کے وہ خواب پھر جاگ جاتے ہیں اور وہ خود سے ہی سوال کرتا ہے کہ اب بھی اس کے دل میں اپنے پیار کا کوئی نقش باقی ہے۔ لیکن اب وہ گزرے لمحوں کو قید نہ کر سکا اور نیلا نے بھی اپنی زندگی میں نئے سفر کا آغاز کر لیا پھر رفیع نے اپنے پیار کی وہ نشانی یعنی نیلا نے تیرہ سال پہلے جو سبز موتیوں والی مالا اسے دی تھی وہ واپس اس کے بچے کے گلے میں ڈال کر اپنے چمکتے آنسو اور دھڑکتے دل کو قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ اس افسانے کا یہ اقتباس دیکھیے:

"تیتری اڑتی ہوئی دور سونف کے پودوں سے پرے شفتالوؤں کے درختوں کی چوٹیوں سے گزر جاتی۔ رفیع حیرت بھری نگاہوں سے اڑتی ہوئی خوب صورت تیتری کی طرف دیکھتا۔" ("نظارے" (ص94)

اس میں جو کہ بھورے رنگ کی چھوٹی تتلیاں ہوتی ہیں جو مئی کے مہینے میں ہزاروں کی تعداد میں زمیں سے نکل کر ہوا میں اُڑنے لگتی ہیں۔ جن کی تعداد اس مقدار سے ہوتی ہے کہ آسماں کم کم ہی نظر آتا ہے۔

ان کا افسانہ "حسن اور حیوان" کشمیر کے محنت کش غریب لوگوں کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ بھی دکھایا ہے کہ ان غریبوں پر کس طرح ٹھیکیداروں اور زمینداروں نے ظلم کرنا شروع کیا۔ اس افسانے میں بے شک کرشن چندر نے کشمیر کے بے بس لوگوں کی منظر نگاری کی ہے۔ لیکن تہذیبی اور لسانی سطح پر تجزیہ کریں تو ان کی تخلیقات میں خطہ پیر پنچال نظر آتا ہے۔ افسانہ "حسن وحیوان" میں پہاڑی زبان کے جو چند لوک گیت دیکھنے کو ملتے ہیں ان کا مختصر اقتباس اس طرح ہے۔

"لا جو آیا۔ لا جو آیا۔
بھلا کپڑے کے لایا وے لا جوا
لا جو آیا۔ لا جو آیا
بھلا جوڑے گنڈھن لایا وے لا جو!"

("کرشن چندر کے سو افسانے" (ص667)

اس اقتباس پر نظر ڈالنے کے بعد اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے رومانیت سے لے کر حقیقی زندگی تک ہر سماجی مسائل سے لے کر بین الاقوامی مسائل تک اس زمیں کے اوپر رہنے والی شے کے ہر پہلو کو اپنے افسانے میں کامیابی سے پیش کیا ہے۔

کرشن چندر کے قلم میں ایسا جادو تھا کہ وہ جس طرف بھی چلتا قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا کتاب کے کفن میں شامل افسانہ "جرا اور جری" میں انھوں نے خطہ پیر پنچال کے پہاڑی علاقے پونچھ کے چھجلا گاؤں کا ماحول پیش کیا ہے۔ چھجلا گاؤں مہنڈر سے تھوڑی دوری پر واقع ہے جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے سب سے اچھے دن گزارے وہ عمر بھر یہاں کے ماحول اور لوگوں کی سچی محبت کو نہیں بھول پائے۔ جرا اور جری اس افسانے کے دو مرکزی کردار ہیں اور ان ہی کے ذریعے کرشن چندر نے ماحول کے ساتھ ساتھ تقسیم ملک کا بہترین نقشہ کھینچا ہے کہ کس طرح لوگوں کی ہستی بستی زندگیاں پل بھر میں بکھر جاتی ہیں۔ دوستی دشمنی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ ملک تقسیم ہوا لوگوں کے خاندان بٹ گئے پل ٹوٹ گیا مگر پھر بھی لوگوں نے ایک پل ٹوٹنے نہیں دیا اور وہ پل جس کا راستہ دلوں کے اندر سے گزرتا ہے جسے نہ کبھی کوئی تقسیم کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

"افسانہ کشمیر کو سلام" میں کرشن چندر کی زندگی کے ساتھ جڑی کشمیر کی یادیں ہیں۔ لیکن اس افسانے کا مرکز پیر پنچال کی ایک تاریخی جگہ

بہرام گلہ ہے۔خطہ پیر پنچال کی پہاڑیوں اور وادیوں میں رنگ برنگے پھولوں، بہتے دریاؤں کے ساتھ سجی ہوئی یہ وادی قدرت کی شاہکار ہیں۔ کرشن چندر نے افسانے میں جو منظر کشی کی ہے وہ آج بھی یہاں کی تہذیب کا حصہ ہے اس افسانے کا مختصر اقتباس پیش خدمت ہے:

''بڈھا موچی مسکرایا اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو، کدھر جا رہے ہو تمہارا نام کیا ہے تمہارا مذہب کیا ہے؟ اور اس نے مجھے کھانا کھانے کو کہا اور میں وہیں اس سرخ بجری کی چھت پر بیٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے لگا اور ایک بہن نے میرے سامنے مٹی کے پیالے میں چاول اور ساگ رکھ دیا اور سفید مکھن کا ایک گولا۔ اور سرخ پسی ہوں مرچیں اور نمک اور میں کھانے لگا، اور ہم لوگ اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے وہ لوگ برسوں سے مجھے جانتے ہوں جیسے میں ان کے گھر کا ہی ایک فرد ہوں''

(کرشن چندر کے سوافسانے (ص1061)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں لوگ بغیر رنگ و نسل، ذات پات ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔اس افسانے میں کرشن چندر نے مٹی کے برتن، ساگ مکھن اور سرخ مرچ وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔در اصل آج بھی اس خطہ کے لوگ مٹی کے برتنوں میں کھانا کھاتے ہیں۔ ساگ یعنی ہرے پتوں والی سبزی اور مولسی سے پسی ہوئی لال مرچ کا استعمال لوگ آج بھی سب سے زیادہ کرتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہاں کی تہذیب اور ماحول کس طرح کرشن چندر کے اندر رچ بس گئی ہے۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کہ یہ بات نہ تھی کہ کشمیر سے باہر کی دنیا خوبصورت نہیں تھی ساری دنیا حسین ہے۔دلکش اور رعنائی دنیا کے ہر کونے میں ہے۔لیکن فطرت کی جو رعنائی اور رنگ میں نے یہاں دیکھے وہ کہیں اور نہیں یہاں کی بے لوس ہنسی وہ پاک محبت مہر و وفا کی مقدس نشانی جو زندگی کے سفر میں ایک انسان دوسرے انسان کو دیتا ہے وہ آج بھی میرے سینے میں اسی طرح محفوظ ہے۔''

(کرشن چندر کے سوافسانے (ص1059)

کرشن چندر کا ایک اہم رپورتاژ''لاہور سے بہرام گلے تک'' کا سفر انھوں نے ایک شادی کے موقع پر کیا اس میں بھی ہمیں جا بجا گوجری اور پہاڑی تہذیب کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ کرشن چندر نے اس میں قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ تاریخی مقامات کا ذکر بھی کیا ہے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کرشن چندر کے خطہ پیر پنچال سے تعلق رکھنے والے افسانوں میں انھوں نے جتنی اچھی منظر کشی کی ہے یا ان کے پاس خوبصورت الفاظ کا جتنا بڑا ذخیرہ ہے وہ انھیں اتنی ہی خوبصورتی سے پیش کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔کرشن چندر نے کسی ایک نظریے کو اپنے افسانوں کا موضوع نہیں بنایا انھوں نے جہاں ایک طرف اس خطے کے حسن کو گلے سے لگایا ہے وہیں دوسری طرف یہاں کی تہذیب، سماجی اور سیاسی مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔اگر نا امیدی ان کے افسانوں کا مرکز بنی تو انہی ٹوٹے ہوئے دلوں کو امید کی کرن دکھانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

کتابیات	اشاعت	مصنف
کتاب کا کفن	ایشا کے عظیم فن کار کرشن چندر ایم۔اے	بیسوی صدی بکڈ پو۔دریا گنج۔نئی دہلی
کرشن چندر کے سو افسانے	حمد خالد چودھری	گنج شکر پرنٹرز،
نظارے	کرشن چندر ایم اے ایل ایل بی	کتب خانہ ادبی دنیا
کرشن چندر کے بہترین افسانے حصہ اول	ریوتی سرن شرما۔او پندر ناتھ	ایشیا پبلیشر پلاٹ نمبر 27/2 سیکٹر 9۔نئی دہلی
کرشن چندر اور ان کے افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ
کرشن چندر کے دس بہترین افسانے	شہزاد منظر	بک کارپوریشن دہلی
کرشن چندر کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر شفیق اعظمی	نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ۔امین آباد لکھنؤ
کرشن چندر شخصیت اور فن	جگدیش چندر ودھاون	کتابی دنیا دہلی

□□□

Shahida Kausar
Research Scholar
Dept. of Urdu
Baba Ghulam Shah Badshah University
Rajori-185234 (Jammu & Kashmir)
shahidac940@gmail.com
Mob: 9622653298

ڈاکٹر خالد محمود

صادقہ نواب سحر کی ڈرامہ نگاری

مختصر جائزہ

عصر حاضر میں اردو فکشن کے میدان میں جو قلم کار اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں ان میں ایک اہم نام صادقہ نواب سحر کا بھی ہے۔صادقہ نواب ہندی مضمون میں پروفیسر کی حیثیت سے فرض منصبی انجام دے رہی ہیں لیکن اردو ادب سے انھیں بے پناہ رغبت ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اردو ادب میں شاعری، ناول، افسانہ اور ڈرامہ کے میدان میں اپنا لوہا منوانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔عصر حاضر میں دلجمعی اور تواتر سے اردو ادب کی خدمات انجام دینے والے تخلیق کاروں کی فہرست میں صادقہ نواب سحر کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔صادقہ نواب کے ناول، افسانے اور ڈرامے ادبی حلقوں میں قبولیت کا شرف حاصل کر چکے ہیں ۔ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر انھیں اعزازات وانعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ان کے مشہور ناول ''راجدیو کی امرائی'' پر انھیں ساہتیہ اکادمی جیسے بڑے اعزاز سے سرفراز کیا گیا ہے۔ جہاں تک اردو ڈرامے کا تعلق ہے تو اس میدان میں بھی انھوں نے کئی اہم ڈرامے لکھ کر اردو ڈرامے کی روایت کو تقویت بخشی ہے۔ عصر حاضر میں اردو ڈرامے کی طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے اور خاص طور پر خواتین قلم کاروں کا رجحان اس طرف بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسے دور میں اردو ڈرامے پر قلم اٹھانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔صادقہ نواب سحر نے عصر حاضر سے جڑے اہم مسائل کو موضوع بنا کر اردو ڈرامے کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا ہے۔وہ اسٹیج ڈرامے سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اسٹیج ڈرامے لکھنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔صادقہ نواب اسٹیج کے لوازمات سے بخوبی واقف ہیں۔ جنھیں وہ اپنے ڈراموں میں برتنے کا ہنر بھی جانتی

ہیں۔ اپنے گردونواح کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی شخصیت میں عوامی خدمت کا جذبہ کارفرما ہے۔ ان کے تمام ڈرامے سماجی مسائل کے آئینہ دار ہیں۔ ''مکھوٹوں کے درمیان'' ان کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ جس میں کل 10 ڈرامے شامل ہیں۔ جن میں جنسی امتیازات، سماجی بے راہ روی، عورت کی مظلومیت، شراب نوشی، بے جوڑ شادی، طبقاتی کشمکش، ظلم و بربریت، غریبوں کا استحصال اور مذہبی تفرقات جیسے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ زیر بحث مجموعے میں شامل ڈرامہ'' دیا جلے ساری رات'' نہایت دلچسپ ڈرامہ ہے۔ جس میں ڈرامہ نگار نے 'باشا' اور 'نوری' کو مرکزی کردار بنا کر سماج میں عورت کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بیان کرتے ہوئے ان کے پیچھے کارفرما سماجی برائیوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ نوری ایک متمول گھرانے کی لڑکی ہے جس کی شادی اس کے پھوپھی زاد بھائی وسیم سے طے ہوتی ہے۔ نوری چونکہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے اس لیے اس کا باپ اپنی ساری جائیداد نوری کے نام رجسٹر کرادیتا ہے اور جب اس کے منگیتر اور اس کی پھوپھی کو یہ اطلاع ملتی ہے تو وہ شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔ نوری کا باپ مجبور ہو کر جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے اپنے نوکر 'باشا' سے زبردستی نوری کا نکاح کرادیتا ہے۔ جس کے لیے نوری کسی بھی صورت میں تیار نہیں ہوتی۔ اسے اپنے باپ پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ نوری کا باپ چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ بھول کر باشا کو اپنی زندگی میں قبول کرلے لیکن نوری کا دل کسی بھی طرح سے باشا کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور نتیجتاً نوری کی فطرت میں دن بدن غصہ اور چڑچڑا پن بڑھنے لگتا ہے۔ بالآخر نوری بے راہ روی کا شکار ہو کر ادھر ادھر غلط تعلقات قائم کر لیتی ہے۔ ''دیا جلے ساری رات'' میں ڈراما نگار نے مختصر مکالموں کے ذریعے کرداروں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے سماج میں عورت کے مقام، اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور بے جا رسومات و نظریات کے پیش نظر عورت کی زندگی کے ساتھ ہونے والے کھلواڑ کو خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

ڈرامہ ''ظلم تو ظلم ہے'' میں ڈرامہ نگار نے انسان کی بے حسی، بے دردی، نفرت اور مظلومیت کو موضوع بنایا ہے۔ عصر حاضر کا انسان اتنا خود غرض، لالچی اور بے حس ہو چکا ہے کہ انسان تو کیا جانور بھی اس کے کارناموں پر شرماتے ہیں۔ انسانوں نے ایک دوسرے کے لیے دلوں میں سانپ پال رکھے ہیں۔ ڈرامہ نگار نے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ عصر حاضر میں انسان ایک دوسرے سے محفوظ نہیں ہے اور اس قدر زہریلا ہو چکا ہے کہ سانپ بھی اس کے زہر سے ڈرتے ہیں۔ جس کو ڈراما نگار نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

ظالم سنگھ: (طنز سے ہنس کر) آتمارام! سانپ کا ڈسا، جانور کا کاٹا بچ جائے۔ آدمی کا ڈسا بچ نہیں سکتا ۔۔۔ پانی تک نہیں مانگ سکتا۔

آتمارام: اور پھر عورت سے تو۔۔۔

ظالم سنگھ: اور پھر عورت ذات ہونہہ!(نفرت سے چہرہ دوسری جانب کر لیتا ہے) عورت ذات تو سب سے زیادہ خطرناک مخلوق ہے

(آتمارام کی جانب دیکھ کر) تم نے بھی تو مزہ چکھا ہے عورت کی بے وفائی کا۔۔۔

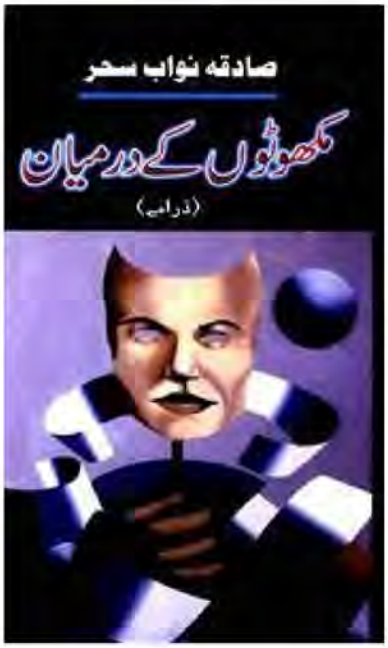

زیر بحث ڈرامے میں ڈرامہ نگار نے ان عورتوں کا ذکر بھی کیا ہے جن کی فطرت میں وفا نہیں ہوتی اور وہ کسی ایک مرد کا گھر بسانے کے بجائے در در کی خاک چھانتی ہیں اور شریف مردوں کی زندگی اجیرن بنا دیتی ہیں۔ ڈرامہ ''اور گھنگرو بجتے رہے'' میں ڈرامہ نگار نے طبقاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ جس میں ایک سیٹھ اور ایک جھونپڑی والے کی زندگی کا تقابل پیش کر کے اونچ نیچ کی تفریق کو ظاہر کیا ہے۔ 'پتو' ایک سیٹھانی کے گھر میں نوکرانی کا کام کرتی ہے۔ سیٹھانی پتو کی بیٹی 'بندیا' کو اپنے بچوں کی طرح انگریزی اسکول میں پڑھاتی ہے اور اسے ڈانس سکھا کر مقابلہ لڑنے کے

لیے تیار کرتی ہے لیکن دوسری طرف پتو کی جھونپڑی کی معاشرتی مجبوریاں نندی کو سیٹھ کے بچوں کی طرح پروان چڑھنے سے روک لیتی ہیں۔ ڈرامے میں دوسرا دلچسپ کردار 'لنگڑ دادا' کا ہے جو ایک ایسے درندے کلوا کو پالتا ہے جو ایک چار سالہ معذور بچی 'بے بی' کی عصمت دری کر کے اس کی جان لے لیتا ہے۔ ڈرامے میں طبقاتی کشمکش شروع سے آخر تک دکھائی دیتی ہے۔ ڈرامہ نگار چونکہ کرداروں کی نفسیات کو بہتر ڈھنگ سے پرکھتی ہیں اس لیے وہ انھیں دلچسپ انداز میں پیش کرنے میں بھی کامیاب ہوئی ہیں۔

''ڈاکٹر کفن پھاڑ'' ایک مختصر اور مزاحیہ ڈرامہ ہے۔ جس کی کہانی کا تانا بانا ڈاکٹر اس کے کمپاؤنڈر لالو اور چند مریضوں کی مدد سے بنا گیا ہے۔ ڈاکٹر ایک مزاحیہ کردار ہے جو دراصل جانوروں کا ڈاکٹر ہے لیکن چونکہ جانور بیمار کم ہوتے ہیں اس لیے فیس حاصل کرنے کے لیے وہ انسانوں کا معالج بن جاتا ہے۔ اسے کسی بھی طرح کے مرض کی تشخیص کا علم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے پاس انسانوں کے علاج کے لیے معقول دوا ہوتی ہے۔ وہ مریضوں کو پانی کے انجکشن لگاتا ہے۔ طرح طرح کے مریضوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے جو فیس ادا نہیں کرتے اور بالآخر مریضوں سے تنگ آ کر وہ چاہتا ہے کہ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ کفن چوری کرنے کا کام کرتا۔ زیر بحث ڈرامہ مزاحیہ ہونے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے کئی ڈاکٹروں کے چہروں کو بے نقاب کرتا ہے۔ ڈرامہ ''تین دو پانچ'' اور ''میرج بیرو'' مزاحیہ ڈرامے ہیں۔ جن کے مختصر اور دلچسپ مکالمے مزاح کے پہلو سے لیس نظر آتے ہیں۔ آج کے اس مصروفیت کے دور میں انسان ذہنی کوفت اور انتشار کا شکار ہے۔ ایسے میں انسان کو خوش رہنے اور خوش رکھنے کے اسباب تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ متذکرہ بالا ڈرامے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں جو انسان کو تھوڑی دیر کے لیے مسرت بہم پہنچاتے ہیں اور خوش رہنے کی تحریک بخشتے ہیں۔

''سلطان محمود غزنوی'' ایک تاریخی ڈرامہ ہے۔ اس میں سلطان کی زندگی اور اس کے دور حکومت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سلطان کے عدل و انصاف کو دکھایا گیا ہے نیز ان الزامات کو بے جا ثابت کیا گیا ہے جو سلطان کے عدل و انصاف پر لگائے گئے تھے۔ اس سے زیادہ عدل کی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ سلطان نے اپنے بھانجے کو بھی نہیں بخشا اور ایک فریادی کی عرضی پر تب تک کچھ کھایا پیا بھی نہیں جب تک وہ اپنے بھانجے کو قتل کر کے فریادی کے ساتھ عدل نہ کرے۔ جس کی تصویر کشی ڈرامہ نگار نے یوں کی ہے۔

فریادی: ایک بات کا تجسس ہے جہاں پناہ!

سلطان: کہو۔

فریادی: مکان میں آتے ہی آپ نے شمع گل کیوں کر دی ؟ اور اندھیرے میں قتل کر کے پانی کیوں پیا؟

سلطان: شمع گل کی کہ بھانجے کی صورت دیکھ کر دل نہ پگھل جائے، اور پانی اس لیے پیا کہ جب سے تمہاری فریاد سنی تھی۔ ظالم کو سزا دلانے تک کھانا پینا اپنے پر حرام کرنے کی قسم کھالی تھی۔ تین دن کچھ کھایا نہ پیا۔ اب تمھاری انصاف پورا ہو چکا تو پیاس کا شدید احساس بھی ہوا۔

فریادی: سلطان کے عدل سے مجھے یہی امید تھی۔

مندرجہ بالا اقتباس سے عدل کے پیمانے کو بخوبی پرکھا جا سکتا ہے۔ ڈرامہ سلطان کے عدل و انصاف اور اس کے دربار میں اعلیٰ و ادنی کے مابین امتیازی فرق نہ ہونے پر مشتمل ہے۔ ڈرامہ ''با ادب با ملاحظہ ہوشیار'' عورت کے ساتھ ہونے والی سماجی ناانصافیوں اور گھریلو تشدد پر مشتمل ہے۔ صادقہ نواب چونکہ خود ایک خاتون ہیں اس لیے وہ عورتوں کی نفسیات اور سماج میں ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو بہتر جانتی ہیں۔ زیر بحث ڈرامے میں ساس بہو کے درمیان نوک جھونک اور اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے سماج میں ناروا سلوک سے نبرد آزما ہونے کے واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ سماج میں ہر ماں کو اپنی بچیوں کی خوبیاں تو دکھتی ہیں اور بسا اوقات ان کی خامیاں بھی خوبیاں لگتی ہیں لیکن جب کسی کی بچی ان کے ہاں بہو بن کر آئے تو اس میں ہزار خامیاں تلاش کرنا ان کا شیوہ بن جاتا ہے۔ زمانہ جہالت کی طرح آج کے دور میں اگرچہ بچیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج نہ سہی لیکن بہت سے گھرانوں میں آج بھی بچی کی پیدائش کو معیوب ضرور سمجھا جاتا ہے۔ ایسا ہی سلوک 'نینا' کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے خاندان میں طرح طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کی منظر کشی صادقہ نواب سحر نے ڈرامے میں یوں کی ہے:

لیکھا: (جٹ سے) اب کی بار کیا؟

نینا: sex determination test کروایا ہے نا!

لیکھا: (تجسس سے قریب آ کر) پھر کیا نکلا!

نینا: وہی جو پچھلی دو بار تھا۔

لیکھا: بیٹی؟

نینا: (ہنس کر) ہاں!

لیکھا: تو کیا۔۔۔، بیٹیاں تو لکشمی کا روپ ہوتی ہیں۔

نینا: میری بڑی نند کے دو بیٹے ہیں وہ مجھے ایک گیت سنایا

کرتی ہے۔

لیکھا: (مسکرا کر) وہ کیا ہے؟

نینا: میرے دیش کی لڑکی سونا نگلے، نگلے ہیرے موتی، میرے دیش کی لڑکی۔۔۔ وہ تو پورا گیت گاتی ہے۔

لیکھا: (ہنس کر) وہ خود میرے دیش کی لڑکی نہیں کیا؟

اس سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سماج میں ایک عورت کو اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے کن کن طرح کے لعن طعن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ نینا کو اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے سسرال والے جلا دیتے ہیں اور یہ معاملہ کسی سے ظاہر نہ کرنے کے لیے اسے دھمکیاں دیتے ہیں کہ اگر وہ یہ راز کہیں عیاں کرے گی تو اس کی بچیوں کو بھی جلا دیا جائے گا۔ نینا اپنی بچیوں کی خاطر سب کچھ برداشت کر لیتی ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور ڈرامہ ''دلہا اور دلہن'' میں بھی عورت کے مسائل کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں ایک غریب خاندان سے تعلق رکھنے والی نو عمر لڑکی کو ایک عمر رسیدہ شخص سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ جہاں اسے دو وقت کی روٹی تو مل جاتی ہے لیکن وہ پیار نہیں مل سکتا جو ایک نوجوان لڑکی اپنے شوہر سے چاہتی ہے۔ آج بھی ہمارے سماج میں شادی کے مسئلے میں بچیوں کی رضامندی کا اعتراف نہیں کیا جاتا اور خاص طور پر غریب خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں تو اس معاملے میں بالکل بھی اپنا حق نہیں رکھتیں۔

''رنگ برنگا بھارت میرا'' ایک مختصر ڈرامہ ہے۔ جس میں مشترکہ تہذیب، قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہندوستان جب انگریزوں کے تسلط میں تھا تو ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے ہندوستانیوں نے ایک ساتھ مل کر اسے آزاد کرانے میں اپنا فریضہ ادا کیا اور اتحاد کی بدولت کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن بعد ازاں کچھ شر پسند عناصر نے رنگ و نسل اور مذہب ملت کی آڑ میں لوگوں کے درمیان خلا پیدا کرنے کی ناکام کوششیں شروع کر دیں۔ صادقہ نواب سحر نے اس ڈرامے میں ہندوستان کو ایک گلدستہ قرار دیتے ہوئے مختلف رنگ و مذہب کے لوگوں کو اس کے بیچ پھولوں کی مانند قرار دیا ہے نیز یہ ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان ایک گلدستہ ہے جس میں طرح طرح کے پھول ہیں اور یہی اس کی خوبصورتی ہے۔ ان میں کسی بھی رنگ کو نکالنے سے رنگ پھیکا پڑ سکتا ہے۔ اسی لیے راحت اندوری نے کہا تھا کہ۔

سبھی کا خون شامل ہے یہاں کی مٹی میں
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

ڈرامہ ''خودکشی یا موت'' میں شراب نوشی اور اس کے مضر نتائج کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک ایسے مرد کی کہانی بیان کی گئی ہے جو کثرت سے شراب پیتا ہے۔ اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہوتا۔ گھر کی ذمہ داریوں، بیوی اور بچوں کے حقوق سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے۔ پہلی بیوی کا کسمپرسی کی حالت میں انتقال ہو جاتا ہے اور پھر وہ دوسری شادی کر لیتا ہے۔ اولاد غلط تربیت اور گھر سے توجہ نہ ملنے پر در در کی ٹھوکریں کھاتی ہے۔ بالآخر لڑکا ایڈز جیسی موذی مرض میں مبتلا ہو کر زندگی کی جنگ ہار جاتا ہے۔ شراب نوشی اور معاشرے و خاندان پر اس کے غلط نتائج کو بڑی ہنرمندی سے دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ صادقہ نواب سحر نے ایک دو ڈرامے اسکولی بچوں کی تربیت کے لیے بھی لکھے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اصلاح معاشرہ کے لیے صادقہ نواب سحر کے ڈرامے اعلیٰ پایہ کی چیز ہیں۔ صادقہ نواب سحر ڈرامے کے فن اور اسٹیج کے لوازمات سے بخوبی واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر ڈرامے اسٹیج پر پیش کیے جانے کے قابل ہیں۔ صادقہ نواب حساس طبیعت کی مالک ہیں۔ عصر حاضر کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ سماج سے جڑے چھوٹے چھوٹے واقعات کو انھوں نے قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے ڈرامے عوامی بیداری کی ایک لہر لیے ہوئے ہیں۔ ڈرامے کے فن کو ملحوظ رکھتے ہوئے صادقہ نواب سحر نے اپنے ڈراموں میں مختصر اور دلچسپ مکالموں کا استعمال کیا ہے۔ اختصار ڈرامے کی خوبی ہے کیونکہ ضرورت سے زیادہ طوالت یہاں کوفت کا باعث بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صادقہ نواب سحر کے ڈراموں میں کہیں پر بھی بے جا طوالت کا احساس نہیں ہوتا۔ دلچسپ ابتدا کے ساتھ ساتھ خوبصورت اور سبق آموز خاتمہ ان کے ڈراموں کا وصف ہے۔ ان کے ڈراموں کے کردار ہمارے معاشرے کے عام انسان جیسے ہیں۔ وہ کرداروں کی نفسیات کو پڑھنے کا ہنر رکھتی ہیں۔ ان کے مکالمے کرداروں کے حسب حال ہیں۔ سر دست صادقہ نواب سحر کا قلم اردو ادب کی خدمات انجام دینے میں کافی متحرک ہے۔ اس لیے دیگر اصناف ادب کے ساتھ ساتھ اردو ڈراما کو فروغ دینے میں ان کے قلم سے مزید تخلیقات کی امید ہے۔

□□□

Dr. Khalid Memood
Village Marhote Tehsil Surankote
District Poonch-185121 (J & K)
Mob no.9682187605
Email:khalidmemood56@gmail.com

شبینہ اختر

مولانا ابوالکلام آزاد ہمہ جہت شخصیت

ہندوستان کی تاریخ میں کچھ ایسی شخصیات نمودار ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے نقوش اپنے عہد اور تاریخ پر اس طرح مرتب کیے کہ زندگی کے تمام شعبہ جات پر قوم کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ اپنی ذہانت و دانشمندی سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ میں ان کا نام تابندہ ستارے کی مانند روشن ہوا۔ بیسویں صدی میں ایسی ہی شخصیات میں ایک نامور ہستی مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ جن کی غیر معمولی فہم وفراست، متحرک کردار و دانشمندی سے تاریخ میں ان کا نابغائے عصر کا مقام حاصل کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے وہ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ مدبر، مفسر قرآن، مفکر وصاحبِ طرز ادیب تھے۔ وہ مجاہد آزادی بھی تھے تو صف اول کے سیاست دان بھی، وہ بے مثال مقرر تھے اور بے باک صحافی بھی، ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے ماہر بھی تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا پورا نام محی الدین احمد تھا، والدمحترم نے ان کا نام فیروز بخت رکھا جسے ان کے تاریخی نام سے بھی جانا جاتا ہے، تخلص آزاد استعمال کرتے تھے۔ ان کے آبا و اجداد ہرات سے عہد بابر میں ہندوستان آئے، پہلے آگرہ میں پھر دہلی میں آکر سکونت اختیار کی۔ مولانا آزاد کے آبا و اجداد کا شمار اس عہد کے علما و صاحبِ طریقت میں ہوتا تھا۔ ان اجداد میں ایک بزرگ جمال الدین نامی عہد اکبر میں اکبر کے دین الٰہی کے اعلان پر ہندوستان چھوڑ کر مکہ چلے گئے۔ انہیں کی پیروی کرتے ہوئے مولانا خیر الدین تقریباً 25 برس کی عمر میں 1857 کے ناکام بغاوت کے بعد ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلے گئے یہ اپنے وقت کے صاحبِ تصنیف اور عالم دین تھے جن کی شادی مکہ کے مشہور عالم شیخ ظاہر وتری کی بیٹی سے ہوئی۔ مولانا آزاد کی ولادت مکہ میں 1888 میں ہوئی۔ مولانا 1898 میں مع اہل وعیال ہندوستان واپس آئے، کلکتہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ مولانا ابو الکلام کی تین بہنیں اور ایک بھائی تھے

موصوف عمر میں سب سے چھوٹے تھے ۔ مولانا خیر الدین چونکہ نہایت مذہبی پیکر کردار کے مالک تھے اور اسی بنا پر ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی ، ہزاروں معتقد اُن کے پاس آتے اور اس طرح گھر کا ماحول ہمہ وقت مذہبی محفلوں ورنگوں سے بھرا رہتا تھا ، روایت پسندی کا رجحان بطورِ خاص پایا جاتا ۔ مولانا فخر الدین نے ابوالکلام و دیگر افراد خانہ کی ابتدائی تعلیم گھر سے شروع کی ۔ روایتی طور پر تعلیم کی ابتدا میں بذات خود فخر الدین نے دی اس کے بعد بہترین اساتذہ مقرر کیے گئے جس سے فقہ ، منطق اور دوسرے علوم کی تعلیم حاصل کی ۔ مولانا آزاد چونکہ نہایت ہی ذہین وفطین طالب علم تھے ۔ جس کے سبب انھوں نے جلد تمام مضامین و فن پر عبور حاصل کیا۔

انگریزی تعلیم یا جدید تعلیم کی طرف مولانا کی توجہ 16 ۔ 17 سال کی عمر میں سرسید کے مضامین پڑھ کر ہوئی ۔ وہ خود اس حوالے سے کچھ یوں فرماتے ہیں:

> ''اس کے کچھ ہی دنوں بعد سرسید کے مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا جدید تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات کا میرے اوپر بہت اثر ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ جب تک کوئی شخص جدید سائنسی فلسفہ اور ادب کا اچھا مطالعہ نہ کرے وہ صحیح معنوں میں تعلیم حاصل نہیں کرسکتا۔ میں نے طے کیا کہ میرے لیے انگریزی پڑھنا ضروری ہے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد کی رسائی انگریزی کی ابتدائی کتابوں سے مولوی محمد یوسف جعفری کی بدولت ہوئی اس طرح انگریزی سیکھنے کے بعد مولانا نے انگریزی کتب کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔

مولانا ابواکلام آزاد کا 19 برس کی عمر میں زلیخا بیگم سے عقد ہوا جن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جو چار سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ مولانا کی شخصیت کے حوالے سے گوپی چند نارنگ یوں بیان کرتے ہیں :۔

> ''مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی تحریک آزادی کا ایک زرّیں باب ، ایک عبقری شخصیت ، رہنما ، قائد ، مدبر ، انشا پرواز ، ادیب ، خطیب بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھے ۔ جس میدان میں قدم رکھا خواہ وہ سیاست ہو ، ادب ہو یا مذہب یا صحافت اپنے عزم وارادے سے اپنی بصیرت سے ذہانت و جوش عمل سے انھوں نے اپنی افضلیت کو تسلیم کرالیا۔''

مولانا کی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے ہوئی ۔ مولانا عبدالواحد سہسراہی کی صحبت کے سبب شاعری سے متعارف ہوئے اور رغبت پیدا ہوئی اور انہیں کی تجویز پر تخلص آزاد منتخب کیا۔ مولانا کا شعری ذوق بہت صاف ستھرا تھا جسے متانت اور توازن نے اعتبار عطا کیا۔ ان کی پہلی غزل ایک گل دستے ''ارمغان فرخ'' ممبئی میں چھپی تھی۔ مولانا نے تخلیقات و تحریرات سے اردو ادب کے اُفق کو بلند کر دیا ۔ ان کے نثری وشعری سرمائے سے اردو ادب کو ایک نئے طرز تحریر ، نئے تصورات وشعور ملا۔ انھوں نے مختلف مضامین ومقالات لکھے جو مختلف رسائل واخبارات میں شائع ہوئے ۔ ان کے مضامین متنوع نوعیت کے ہیں ۔ علمی ، تحقیقی ، اصلاحی ، فکر و فلسفہ سے لبریز تمام رنگ پائے جاتے ہیں ۔ مختلف موضوعات کو اپنی فکر روشن سے اُجاگر کیا جن میں سائنسی مضامین ایک خاص مقام رکھتے ہیں ۔

ان کی نثر میں جلال ، خطابت ، ڈرامائیت اور اجتماعی زندگی میں ایک ہلچل برپا کرنے کی قوت ہے۔ ان کی نثر میں شاعری کا استعمال جا بہ جا نظر آتا ہے۔ ان کی نثر کا اسلوب آراستہ و پیراستہ ہے جو انفرادیت کے ساتھ ایک مقام طے کرتا ہے ۔ انشا پردازی و رنگین اسلوب ان کی نثر کی خاص خصوصیت ہے احمد سید ملیح آبادی ان کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں ۔

> ''ان کے انشاء پر مصری عالم سید رضا اور ان کے رسالے ''المنار'' کی چھاپ گہری تھی جو مولانا کے مطالع میں شروع سے تھا۔ مولانا کی فکر پر کچھ اثر جمال الدین افغانی اور مصری عالم شیخ عبدہ کا تھا۔''

مولانا نے رانچی میں نظر بندی (1916-1919) کے دوران اپنی خودنوشت سوانح تذکرے کے نام سے لکھی۔ انھوں نے اسی دوران ترجمان القرآن تالیف کی دو جلدیں منظر عام پر آئی جس میں قرآن پاک کے 18 پاروں کی تفسیر مع حواشی کی ہے جسے اردو نثر کا بہترین نمونہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا بیانیہ اسلوب اس کی خوبی خاص ہے اس کارنامے کی انفرادیت اس کے ادبی اسلوب میں نمایاں ہے۔ مولانا کے ادبی کارنامے میں ''آزادی کی کہانی آزاد کی زبانی'' بھی اہمیت کی حامل ہے ۔ یہ علی پور سینٹرل جیل میں 1921 میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو بول کر لکھوائی گئی تھی جو 1958 میں شائع ہوئی۔

مولانا کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں ''غبار خاطر'' قلعہ احمد نگر کی تین سال کی اسیری کی یادگار ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ادب ، تاریخ وثقافت کا خوبصورت امتزاج ہے ۔ ان خطوط کے مجموعوں میں انشائیے کے ساتھ ساتھ مقالات کے عناصر بڑی

خوبصورتی سے پائے جاتے ہیں۔ ان خطوط میں اختصار و جامعیت بھی ہے اور بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو صحافت سے طالب علمی کے زمانے سے ہی دلچسپی رہی۔ ابھی حصول تعلیم سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ گلدستہ ''نیرنگ عالم'' کا اجرا 1899 میں کیا۔ یکے بعد دیگرے انھوں نے کئی گل دستے شائع کیے انھوں نے اردو صحافت میں نا آشنا روایتوں کو جنم دیا اور اس طرح صحافت میں طرز نو کی بنیاد ڈالی اور اس طرح صحافت کو ہمدوش ادب کر دیا۔ انھوں نے سب سے پہلے مصور اخبار نکالا وہ مختلف اخبارات سے منسلک رہے۔ 1902 میں ''احسن الاخبار'' کے تحریری ادارہ سے وابستہ رہے۔ 1903 میں ''خدنگ نظر'' لکھنو ادارت کے فرائض انجام دیے۔

سماج کی مثبت تعمیر کے لیے عوام تک سچ پہنچانے کے لیے انھوں نے کم و بیش ایک درجن اخبارات و رسائل ایڈیٹ کیے۔ 1903 میں انھوں نے رسالہ ''لسان الصدق'' جاری کیا جو 1905 میں بند ہوا۔ اسی سال مولانا نے لکھنؤ میں شبلی کے زیر اثر آئے اور الندوہ کے نائب مدیر بنے۔ 1906 میں امرتسر میں اخبار وکیل کی ادارت سنبھالی اس کے علاوہ کلکتہ کے ہفت روزہ دارالسلطنت کے ادارۂ تحریر سے بھی وابستہ رہے۔

مولانا نے 1908 میں مشرقی وسطی اور فرانس کا سفر کیا۔ انھوں نے بالخصوص عراق، مصر، شام اور ترکی میں وقت گزارا۔ مولانا وہاں کے مشہور انقلاب پسندوں کے روشن خیالوں سے روبرو ہوئے۔ مصر کے مفتی عبدہ اور مصطفیٰ کامل پاشا سے ان کی متاثر کن ملاقات ہوئی جس سے ان کے افکار و خیالات کافی متاثر ہوئے۔ مولانا نے اس سفر میں فرانسیسی زبان ضرورت کے مطابق سیکھ لی جسے انھوں نے بعد میں فلسفہ و تاریخ کا مطالعہ کرنے میں تعاون ملا۔

مولانا اخبارات و صحافت کے ذریعے برطانوی حکومت کی مخالفت کے ساتھ ساتھ ہندو مسلمان اتحاد کو استحکام بنانے کے مقاصد کو زیر نظر رکھتے تھے۔ مولانا نے ایک اہم اخبار 'الہلال' 1912 میں جاری کیا۔ جس نے تاریخ میں اپنا کلیدی کردار نا صرف سیاست و جد و جہد آزادی میں بلکہ قوم کی اصلاح میں بھی ادا کیا۔ الہلال میں مذہب، سیاست، جغرافیہ، نفسیات، معاشیات، عمرانیات، سوانحی ادب اور حالات حاضرہ پر مضامین و مقالات لکھے جاتے تھے۔ جن کی زبان پُر اثر ولولہ انگیز ہوتی تھی جو ہندوستانی قوم کے ذہنی شعور کو دینی و سماجی تمام شعبا جات میں روشنی کی کرن کی مانند رہے۔ اس کی مقبولیت اور اس کے بڑھتے ہوئے باغیانہ عناصر سے حکومت ہند آشنا تھی جس سے یہ بھی حکومت برطانیہ کے عتاب کا شکار رہا۔ حکومت نے ستمبر 1913 کو 2000 کی ضمانت طلب کی موصوف کے جمع کروانے کے بعد پھر سے 10000 کی ضمانت طلب کی۔ اس طرح پے در پے ضمانتیں طلب کی جانے لگیں اور آخر میں ضبط کر لیا گیا۔ مولانا نے پرواہ نہ کرتے ہوئے البلاغ جاری کیا۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کی بدولت و آزادی کی طلب کے عوض حکومت بارہا نظر بند، قید کرتی رہی جس سے ان کی صحافتی زندگی دوسرے تمام پہلو کے ساتھ متاثر ہوتی رہی۔ البلاغ بھی زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ جون 1927 میں مولانا نے الہلال پھر سے شروع کیا لیکن بدنصیبی سے چھ ماہ تک کا ہی سفر کر سکا۔ اس طرح تسلسل کے فقدان کیسبب ان کی صحافتی دنیا بہت متاثر ہوئی اور اسی کے ساتھ ان کی صحافتی زندگی ختم ہوئی۔

مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک پہلو سیاست سے دلچسپی تھی۔ ابھی صرف 16 برس کی عمر میں تھے کہ سیاسی دلچسپی اور اس کے مقصد کے لیے تحریر و تقریر شروع کی وہ وقت کی سیاست کے بڑے نباض تھے اور اپنی دلچسپی کے بارے میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

''میں مسلسل بارہ سال سے اپنی قوم و ملک کو آزادی و حق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میری اٹھارہ برس کی عمر تھی جب میں نے اس راہ میں تحریر و تقریر شروع کی۔''

سیاسی میدان میں ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے بنیادی اصول ان کے طرز عمل و یقین میں شامل تھے۔ مولانا نے مسلمانوں کو غیر مسلمان قوم کے دوش بدوش آزادی کی جد و جہد کے لیے مائل کیا۔ اس پہلو میں وہ سرسید کے برعکس نظر آتے ہیں لیکن جس دور میں انھوں نے قوم کو اس جد و جہد کی تلقین کی اس وقت زمانے کا تقاضہ اس بات کا مطالبہ کر رہا تھا۔ سرسید نے جدید تعلیم پر مائل کیا اور اس کے بغیر سیاست میں آنے سے گریز کیا۔ مولانا کے ذہن میں متحدہ قومیت کا تصور واقع تھا، بلکہ وہ مشترکہ تہذیب کے رسیا تھے۔ یگانگی و بھائی چارے کے لیے ان کی معنویت رہے۔ برطانوی حکومت نے جو ذاتی مفاد کے لیے جو تفریق و تحکم کے ہتھکنڈے آزمائے انہیں مولانا خوب سمجھتے تھے۔ بنگال کی تقسیم کے نتیجے میں جو نفاق ہندو مسلم دو قوموں کے دلوں میں ڈالا گیا اس کی اصلاح و درستگی کے لیے ہندو قوم کے انقلابیوں سے رابطہ کر کے ان کے دلوں سے غلط فہمیاں دور کر کے اتحاد کی سعی کی۔

حکومت نے کئی جگہوں پر ان کے جانے پر پابندی لگا رکھی تھی، کئی دفعہ نظر بند ہوئے، مختلف تحریکوں کے سلسلے میں انھیں یہ سزائیں دی گئیں۔ ان کی زندگی کے کل ملا کر دس برس اور سات ماہ قید و بند میں رہے

۔گاندھی جی کی قیادت میں مولانا نے عدم تعاون میں حصہ لیا۔تحریک خلافت اور دیگر تحریکات سے بھی وابستہ رہے۔1939 میں کانگرس کے صدر منتخب ہوئے۔1946 میں ہندوستان چھوڑوتحویز کے بعد کانگرس کے تمام بڑے لیڈروں کے ساتھ مولانا کو بھی گرفتار کر دیا گیا۔اس بار قید کی مدت تین سال رہی 1945 تک قلعہ احمد نگر جانکوڑا جیل میں گزری۔

آزادی کے بعد مولانا گاندھی جی کے اصرار پر وزیر تعلیم کے عہدے پر فائز ہوئے۔اس شعبے میں مختلف کارہائے نمایاں انجام دیئے جن میں اعلیٰ تعلیم کے معیار کے اقدامات اٹھائے گئے وہ تعلیمی نظام میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے عہد وزارت میں IIT Kharagpur, IIT Mumbai, IIT Chennai اور 1956 میں یو جی سی کا قیام عمل میں آیا۔اس کے علاوہ انھوں نے ثقافتی ادارے قائم کیے۔

مولانا صحافی، مجاہد آزادی، بلند پایہ ادیب اور وزیر تعلیم کی حیثیت سے زندگی گزار کر 22 رفروری 1958 کو دارِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔ مولانا ایک عظیم مذہبی دانشور تھے، صحافی تھے، ادیب تھے فلاسفر بھی ان سب سے زیادہ ایک عظیم سیاسی رہنما تھے۔آزادی کے جدو جہد میں ان کی خدمات اور قربانیاں کبھی نہیں بھلائی جا سکتی اور نہ ہی پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کی لاثانی خدمات کو کبھی صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔

□□□

Shabina Akhter
Research scholar
Jammu University
Baba Saheb Ambedkar Road
Jammu Tawi-180006 (J & K)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کار کی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.............................. ......بتاریخ..............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

مبینہ

شوکت کیفی

بحیثیت خودنوشت نگار

'یاد کی رہ گزر' کے آئینے میں

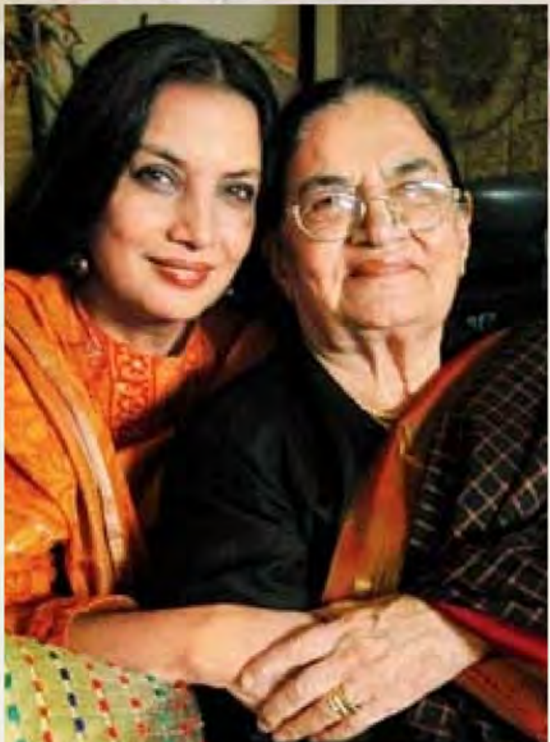

عورت کتنی ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو جائے اس کا تعارف پھر بھی کسی مرد کے حوالے سے ہوتا ہے جیسے شوکت کیفی مشہور شاعر کیفی اعظمی کی شریک حیات ہیں۔ اسی طرح شوکت کیفی کا تعارف زیادہ تر جگہوں پر دیکھا جا سکتا ہے لیکن، ہم دیکھیں تو اس عورت نے بڑی تخلیقی صلاحیتوں سے اردو کی اس نثری تصنیف میں اپنی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں۔ ''یاد کی رہ گز'' ان کی آپ بیتی ہے اس کا مطالہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کے تھیٹر کی دنیا میں ان کا کیا رتبہ تھا، فلموں میں ان کی اداکاری کے کیا معنی ہیں، انھوں نے گانے کی پہل کیوں کی، ڈریس ڈزائن سے لے کر ریڈیو کی دنیا میں انھوں نے کیا کچھ بدلا، سماجی سروکار اور بے حد معمولی لڑکے کے عشق میں ان کی غیر معمولی بغاوت اور بے پناہ محبت کے احساس میں ہر طرح کی محرومیوں سے لڑتے ہوئے زندگی کی جدوجہد میں کبھی حوصلہ نہ ہارتے ہوئے ان کی پوری زندگی دراصل ایک انقلابی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ شوکت کیفی کے اسی

حوصلے اور ہمت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اس مضمون میں ان کی تحریر ''یاد کی رہ گزر'' سے مختلف حوالوں کے ساتھ ان کی نثری زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے کچھ مضامین کیفی کی زندگی میں ہی رسائل میں شائع ہونے لگے تھے۔ جیسا کہ اس کتاب سے ہی معلوم ہوتا ہے۔

''یاد کی رہ گزر'' کے کچھ حصے کیفی صاحب کی زندگی میں ہی شائع ہوتے رہے۔''

(یادکی رہ گزر، شوکت کیفی، اسٹار پبلیکیشن دہلی۔2006۔ص11)

کیفی اعظمی کے گزرنے کے بعد انھوں نے ان شائع اور غیر شائع شدہ حصوں کو یکجا کر کے اس کتاب کی شکل میں شائع کیا ہے۔ شوکت کیفی کی خودنوشت 'یاد کی رہ گزر' 2006 میں اسٹار پبلیکیشن، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں 223 صفحات پر مشتمل 32 مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کا پیشِ لفظ پروفیسر قمر رئیس نے لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے کتاب میں بیان کیے گئے ہر حصے کی تلخیص بیان کی ہے۔ ساتھ ہی اس خودنوشت کی اہمیت کا بیان بھی کیا ہے۔ قمر رئیس لکھتے ہیں

''اس میں رومانوی ہیجان بھی ہے، کڑوی کسیلی زمینی سچائیوں کا دبا دبا کرب بھی، ازدواجی زندگی کا انمول حسن اور آسودگی بھی اور اس کی محرومیوں اور دکھ کا وہ احساس بھی جو دل کو نچوڑ کر رکھ دیتا ہے۔''

(یادکی رہ گزر، شوکت کیفی، اسٹار پبلیکیشن دہلی۔2006۔ص51)

پروفیسر قمر رئیس کے پیشِ لفظ کے ساتھ ساتھ سلمیٰ صدیقی کا مضمون بھی شامل ہے۔ یہ کتاب 'یاد کی رہ گزر' شوکت کیفی کی پہلی تصنیف ہے۔ پہلے ہی صفحے پر شوکت نے لکھا ہے، ''یہ کتاب میں اپنے دونوں بچوں شبانہ اعظمی اور بابا اعظمی کے نام معنون کرتی ہوں جو مجھے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہیں۔'' شوکت کیفی کی پیدائش 1928 کو حیدرآباد کے ایک روشن ضمیر مولوی کے خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے دادا کا مزاج دینی معاملات میں بے حد کٹر قسم کا تھا۔ ان کے مزاج کی وجہ سے ہی شوکت کے والد انگلش تعلیم سے محروم رہ گئے تھے۔ حالانکہ بعد میں انھوں نے چھپ کر انگریزی میں دسترس حاصل کر لی تھی۔ شوکت کے دادا کی بندشوں کی وجہ سے ان کے والد روشن خیال ہوگئے تھے۔ شوکت نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ ان کے والد کی جب شادی ہوئی اور وہ بیگم کو حیدرآباد لے کر آئے تو انھوں نے اپنی نئی نویلی دلہن کا دہلی اسٹیشن پر ہی برقع اتروا دیا تھا۔ والد کے اسی مزاج کی وجہ سے شوکت اور ان کے بہن بھائیوں نے کھلے ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس زمانے میں جب عورتوں کی تعلیم کو ایک بہت بڑا عیب تصور کیا جاتا تھا شوکت اور ریاست خانم نے مخلوط تعلیم پائی۔ ان کا یہ قدم خاندان کی مرضی کے خلاف تھا۔ آگے چل کر شوکت کیفی فلمی دنیا میں ایک عظیم اداکارہ کے طور پر جانی گئیں۔۔ انھوں نے پرتھوی تھیئٹر اور آئی پی ٹی اے کے ڈراموں میں لمبے عرصے تک اداکاری کی ہے۔ ان کی مشہور فلمیں ''گرم ہوا''، ''سلام بامبے'' اور ''امراؤ جان ادا'' ہیں۔ جس میں سب سے زیادہ شہرت امراؤ جان ادا نے حاصل کی۔

شوکت کیفی کی داستانِ حیات 'یاد کی رہ گزر' ان کے شوہر اور بچوں کی ایک ایسی دنیا ہے جس میں قاری شریک ہوکر خود کو اس گھر کا ہی ایک فرد سمجھنے لگتا ہے۔ کہانی میں درد بھرے وہ لمحات ہیں جن کا مداوا کرنا ناممکن ہے۔ شوکت کیفی کی ہمت اور سچی محبت کی یہ داستان خوبصورتی سے صفحہ قرطاس پر سجادی گئی ہے۔ سب سے پہلے کتاب میں شوکت نے اپنے شہر حیدرآباد کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے نمبر پر شہر اورنگ آباد کا ذکر ہے، جہاں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا، یہ ان کی محبت کا شروعاتی دور تھا۔ اس کے بعد اجنتا ایلورا کی گپھائیں شامل ہیں۔ وہیں کیفی نے ایک خوبصورت نظم ''تم'' شوکت کی نذر کی۔ اس کا پہلا شعر:

شگفتگی کا لطافت کا شاہکار ہو تم
فقط بہار نہیں حاصل بہار ہو تم
(کیفی اعظمی)

ان کی محبت پہ پہرے بٹھا دیئے گئے۔لیکن اس مشاعرے کے بعد شوکت کا ارادہ مضبوط ہو گیا اور اپنے والد کے ساتھ انھوں نے ممبئی کا سفر کیا۔اسی سفر میں ترقی پسند شاعروں کے درمیان سردار جعفری، سلطانہ آپا، میرا جی وغیرہ کی موجودگی میں ان کی شادی کیفی سے ہوگئی۔1947 میں ہوئی اس شادی میں شوکت کی والدہ اور بھائی کی مخالفت بھی شامل تھی۔ نکاح کے بعد ہی شوکت نے کیفی کا اصلی نام اطہر حسین رضوی، ولد فتح حسین رضوی جانا۔ یہ شادی ایک شیعہ یعنی کیفی اور سنّی یعنی شوکت کے درمیان ہوئی تھی۔اس کے بعد 'لکھنؤ اور مجواں' عنوان ہے جس میں شادی کے بعد پہلی بار لکھنؤ کا سفر یعنی شوکت اپنی سسرال گئیں۔شوکت چونکہ حیدرآباد کی تھیں۔انھیں لکھنؤ کا لہجہ بہت اچھا لگا۔لکھتی ہیں:

''لکھنؤ پہلی بار گئی تھی اور یہ شہر میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔
یہاں کے لوگوں کی زبان اور لہجہ بہت خوبصورت تھا لکھنؤ میں
دو طرح کے لکھنؤ تھے۔ایک پرانا لکھنؤ اور ایک نیا لکھنؤ۔
واجدہ باجی کا گھر پرانے لکھنؤ میں تھا۔وہاں کا ماحول بھی
دلچسپ تھا۔''

(یاد کی رہ گزر،شوکت کیفی،اسٹار پبلیکیشن دہلی۔2006۔ص83)

مجواں میں کیفی کا گھر تھا۔یہ گاؤں بہت چھوٹا تھا یہاں تک کہ اس میں کوئی دکان بھی نہیں تھی۔ یہاں کی عورتوں کے سامنے شرمانا اور جھک کر بیٹھنا ضروری تھا۔چار مہینے وہاں رہیں بہت سی یادیں کیفی کے بچپن کی ان کی آپا کی زبانی سنیں۔پھر ممبئی کو رختِ سفر باندھا ممبئی میں کیفی کی گرفتاری کے بعد حیدرآباد اپنے والدین کے گھر آگئیں۔وہیں ان کے پہلے بیٹے خیام کا انتقال ہوا۔شادی کے بعد شوکت کیفی بھی ترقی پسند ادیبوں کے خاندان کا ایک حصہ بن گئی تھیں۔اس خودنوشت میں اس وجہ سے ایک داستان ان ترقی پسند قلم کاروں کی بھی تحریر کی گئی ہے۔جیل اور مضبوط قوت ارادی، گھر سے بے گھر غربت میں رہنے والے کی یہ سب جنگ جو قلم کار کس طرح معاشرے کی اصلاح کے لیے پریشان حال تھے، یہ کیسا جنون تھا جوان کے سروں پر سوار تھا، کیسے متوالے تھے جو اس تحریک کی آبیاری کے لیے اپنے تن، من، دھن سے نچھاور تھے۔شوکت کیفی نے اپنی اس تحریر میں زندگی کے ہزاروں راز آشکار کر دیئے ہیں۔

شادی کے بعد ان کی زندگی میں کچھ نہیں تھا۔پریشانیوں اور غموں کا ہجوم تھا اور دونوں میاں بیوی تھے۔نئی زندگی کا آغاز اور ایک کمرے میں جھلنگا پلنگ۔روایتی شاعری اور شاعر کی تمام تر غریبی اس ایک کمرے میں سمٹ آئی تھی۔انتہائی غریبی کے عالم میں اپنا اور پھر اپنے شوہر کا خیال رکھنا ایک باہمت عورت کا کام ہے۔ یہاں تک ہی نہیں انھوں نے اپنے بچوں کی پرورش کا ذمہ بھی اپنے سر لیا تھا۔شوکت کی زندگی میں یہ خوشی بڑے حوصلے سے شامل ہوئی تھی۔نشیب وفراز کی پرغم روداد پر لطف بھی ہے اور غم انگیز بھی۔یہ موسم کا تبدیل ہوتا مزاج سرد وگرم داستان کی یہ رنگارنگی ان کی زندگی کے کرب آمیز لمحات کی روداد ہے۔

شوکت کیفی کی خودنوشت سے ان کے قابلِ تسخیر عزم کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔سادگی میں لکھی گئی یہ تحریر بے حد حوصلہ بخش اور امید افزا ہے۔کم صفحات میں مصنفہ نے بڑی بات قاری کے سپرد کردی ہے۔اپنی انقلابی سوچ کی وجہ سے کیفی جیل بھی گئے، مصیبتیں جھیلیں لیکن شوکت نے ان کے ہر مشکل وقت میں ان کے ساتھ کھڑے ہو کر سہارا دیا۔ممبئی سے دوبارہ حیدرآباد جب آئی تو ایک بار کمیونسٹ پارٹی کے پیس مومنٹ کے اعلان نامے پر دستخط کا کام جوان دنوں بہت زور وشور سے چل رہا تھا۔اس میں بھی ایک دو دن کا تجربہ لیا، بہت واضح ترقی پسندانہ نقطۂ نظر، دردمندانہ احساس اور انسانی تہذیب کے روشن وژن کے ذریعے شوکت کیفی نے اس آپ بیتی کو ذہنی اور جذباتی سطح پر معنویت بخشی ہے۔اس باب میں شبانہ کی پیدائش اور واپس ممبئی آنے کا حال بھی رقم کیا ہے، اسی باب میں شوکت نے عصمت چغتائی کی ہمدردی کو بھی یاد کیا ہے۔کیفی جیل سے رہا ہوتے ہی انھیں واپس ممبئی لے آئے۔اس کے بعد شبانہ کی پیدائش کا مرحلہ سر کیا۔ کیفی انڈر گراؤنڈ ہو گئے، کامریڈ کوئی نیا بوجھ بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ بڑا پُرآشوب دور تھا جب شوکت کی پہلی بیٹی ان کے حمل میں تھی اور کامریڈ ساتھیوں نے اس حمل کو ضائع کرنے کا فرمان سنا دیا۔کیفی اس وقت انڈر گراؤنڈ تھے مگر پھر بھی شوکت اپنے اس بچے کو زندہ رکھنا چاہتی تھیں۔انھوں نے اپنے بل بوتے پر اس بچے کی پرورش کا فیصلہ لیا۔مضبوطی سے سب کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔کامریڈ ان کی ہمت کے سامنے ہار گئے اور شوکت نے تن تنہا اپنے بچے کی نگہداشت کی۔اس دوران ہر کام جو بھی انھیں ملا، کیا۔انھوں نے اپنے بچوں کی نہ صرف پرورش کی بلکہ ان کا خیال رکھا انھیں بہترین تعلیم دی اور اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ترقی کی راہ طے کرنے کے لیے گھر کا خیال رکھا اور کیفی کو خوش رکھنے کی مکمل کوشش کی۔اس سخت ترین وقت کو گزرنا تھا گزر ہی گیا۔اگر اس وقت ڈٹ کر نہ کھڑی ہو گئی ہوتیں تو شبانہ جیسی ہستی ہمارے ساتھ نہ ہوتی۔ان کی پیدائش

سے متعلق لکھتی ہیں؛

''شبانہ ہونے کو تھی۔ کیونکہ میرا پہلا بچہ گزر گیا تھا اس لیے میں تو بہت خوش ہوگئی لیکن پارٹی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔'' آرڈر ہوا ابارشن کروادیا جائے۔'' کیوں کہ کیفی انڈر گراونڈ ہیں۔ میں بے روزگار ہوں۔ بچے کی ذمہ داری کون لے گا۔ مجھے بے حد تکلیف پہنچی۔ اس بات پر جب ایک میٹنگ ہوئی تو اس میں میں نے کہا۔'' یہ بچہ مجھے چاہیے اور جیسے بھی ہو میں اسے پالوں گی۔ مجھے بہت کچھ کہا گیا لیکن میں اپنی جگہ اڑ گئی تھی۔ اس میٹنگ میں صرف ہمارے دوست مہدی نے میرا ساتھ دیا۔ آخر پارٹی نے مجھے یہ بچہ پیدا کرنے کی اجازت دے دی۔''

(یادکی رہ گزر، شوکت کیفی، اسٹار پبلیکیشن دہلی 2006۔ ص 99)

زندگی میں بہت بار کیفی انڈر گراونڈ رہے لیکن کیفی نے انھیں ہر لحاظ سے ہمت دینے کی کوشش کی۔ اپنی ایک نظم میں لکھتے ہیں:

اٹھ میری جان! میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
قلب ماحول میں لرزاں شرر جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولہ سنگ ہیں آج حسن اور
عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہے آج
جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے

(کیفی اعظمی)

کتاب میں انھوں نے اپنے لکھے بہت سے خطوط بھی شامل کیے ہیں اور اپنے پاکستان کے سفر کو بھی درج کر کے اسے یادگار بنا دیا۔ شبانہ اور بابا کے بچپن سے جڑے بہت سے واقعات، زندگی میں ملے لوگوں کی مختصر یادیں، فلموں اور ڈراموں کا ذکر جو بہت مقبول بھی ہوئی اس کتاب کا مواد بنی۔ کملا بائی عنوان سے ایک غریب لیکن خوددار عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ کتاب کے آخری عنوانات ''کیفی کی بیماری'' اور ''کیفی کے بغیر'' بے حد پرسوز ہیں۔ کیفی نے زندگی میں کبھی اپنی تکلیف کا ذکر نہیں کیا۔ اشتراکی نظریے پر یقین رکھ کر نظم اور غزل دونوں تحریر کیں۔ کیفی بچپن ہی سے کافی حساس تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ کہ انھوں نے اپنے گھر میں بیماریوں اور دکھوں کا ایک بڑا ہجوم دیکھا تھا، وہ اپنے اطراف میں رہنے والے لوگوں کی مصیبتوں، پریشانیوں اور بھوک و افلاس میں رہ کر زندگی گزارنے والے دبے کچلے انسانوں کے دکھ درد سے بخوبی واقف تھے۔

اس لیے وہ بچپن ہی سے کسی بھی خوشی میں اپنے افراد خانہ کے ساتھ شرکت نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ہی عید پر نئے کپڑے پہنتے تھے انھوں نے ان لوگوں کو بڑے قریب سے دیکھا تھا جن کے گھر میں نہ تو چولہے جلتے تھے۔ نہ نئے کپڑے انھیں میسر تھے۔ وہ اپنے گاؤں کو بھی کبھی نہیں بھولے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وہ میرا گاؤں ہے وہ میرے گاؤں کے چولہے
کہ جن میں شعلے تو شعلے دھواں نہیں ملتا

(کیفی اعظمی)

کیفی اپنے گاؤں کو بے حد پیار کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بمبئی جیسے بڑے شہر کو چھوڑ کر اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے چلے گئے۔ ان کی عمر کے آخری ایام بے حد تکلیف دہ تھے، وہ لکھتی ہیں۔

''لیکن جیسے آہستہ آہستہ دیئے میں تیل ختم ہونے لگتا ہے اور اس کی روشنی مدھم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح کیفی آہستہ آہستہ بجھتے چلے گئے اور آخر دس مئی 2002 کی اس منحوس صبح کو چھ بجے ہمیشہ کے لیے بجھ گئے اور میری زندگی کو ہمیشہ کے لیے گھپ اندھیروں میں چھوڑ گئے۔''

(یادکی رہ گزر، شوکت کیفی، اسٹار پبلیکیشن دہلی 2006۔ ص 206)

شوکت کیفی بھی 23/دسمبر 2019 کو انتقال فرما گئیں۔ الحاصل چشم دید واقعات اور حیدرآبادی رنگ میں شروع ہوئی اس کتاب کی سب سے زیادہ پسندیدہ بات ہے شفاف انداز بیان۔ رواں دواں چھوٹے چھوٹے اسباق و جملے پھر طوفانی عشق، قوت ارادی میں یکتا عورت کی ایسی کہانی شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اس کتاب میں ایسے متعدد واقعات ہیں جو شوکت اور ان کے اہل خانہ پر پڑی سختیوں اور مشکلات کو واضح کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام آزمائشیں ان کے حوصلوں کو ڈھا نہ سکیں اور یہ فنکار اپنی رفتار سے ادب اور آرٹ کی خدمت میں لگے رہے۔

Mobina
Scholar
Department of Urdu
University of Delhi
Delhi-110007
Mob. 8010798159
m391884@gmail.com

غزلیں

فرحانہ نازنین

خو میں کسی ظالم کے شرافت نہیں ہوتی
کم ظرف کی امداد سخاوت نہیں ہوتی

پیتے ہیں لہو اپنے ہی محسن کا ستم گر
نظروں میں کبھی ان کے ندامت نہیں ہوتی

تعلیم سے انسان سنورتا ہے جہاں میں
ہر شخص کی فطرت میں نفاست نہیں ہوتی

ایک فرد پہ ہو ظلم تو کرتے ہیں تماشا
قوموں کی غلامی پہ بغاوت نہیں ہوتی

دل سوز سے خالی ہو تو تاثیر کہاں کی
سجدوں سے مکمل تو عبادت نہیں ہوتی

کیفر کردار میرا آپ کے ہاتھوں میں ہے
آپ کی جنبش کشائی معتبر کر دے مجھے

میں کروں شکوہ کہاں میری زباں کو تاب ہے
آنکھ کا پانی مگر کیوں تر بتر کر دے مجھے

حاصل تسلیم جاں ہے سر جھکانے کی ادا
تیرے در پہ آ گئے، اب بے خبر کر دے مجھے

میری دنیا تھی کہاں، اک قید خانے کے سوا
دی رہائی اس لئے کہ در بدر کر دے مجھے

قافلے کے ساتھ چلنا حاصل مقصود ہے
منزلوں کے پاس لا کر، سر بسر کر دے مجھے

کام آئی ہی نہیں جب نازنین تیرے کوئی
عقل کی حد سے نکل کر درگزر کر دے مجھے

Farhana Naazneen
18/6, C Blocok
Firdaus Manzil
Second Floor
Okhla Vihar, Jamia Nagar
New Delhi-110025
Mob: 9470705183
E-mail: mefarhanaimrat@gmail.com

حسنِ سخن

زبیدہ شکیل

ماں! تم مجھے اب بھی یاد آتی ہو

ماں! تم مجھے اب بھی یاد آتی ہو!
سنا ہے کہ
جانے والوں کو لوگ بھول جاتے ہیں؟
وہ غلط کہتے ہیں
یا وہ
مبتلا کسی غلط فہمی میں رہتے ہیں
پتہ ہے؟
میں اپنے ہاتھوں کی تمام انگلیوں کو
بہت محبت سے دیکھتی ہوں
نہ جانے کون سی انگلی پکڑ کر
تو نے چلنا سکھایا ہوگا
جب بھی میں روتی ہوں گی سیاہ راتوں میں
تو نے گلے لگایا ہوگا،،،،
ماں! وہ تیرا لمس آج بھی ہے یاد مجھے
وہ تیری نصیحتیں
ہدایتیں ہیں یاد مجھے
میری آنکھیں، بہت خوش ہوتی ہیں
دیکھ کر
مجھ میں تیری مشابہت بھی ہے
ماں! وہ جو تیرے خواب تھے،
میں انھیں اب اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہوں
بہت سمجھایا اپنی آنکھوں کو،
لیکن نہ جانے کیوں؟
یہ اشک بار رہتی ہیں
جب بھی کہیں چوڑی کھنکھناتی ہے

ماں! جب تیری اور بھی یاد آتی ہے
کتنے دنوں سے پکارا نہیں ماں! کہہ کر
اور کتنے دنوں سے تو نے آواز نہیں لگائی ماں!
جب بھی سنتی ہوں میں لفظ محبت
اول و آخر مجھے تیرا خیال آتا ہے
مجھے پتہ ہے ماں!
تم دور چلی گئی ہو
لیکن
مجھے محسوس ہوتا ہے
تم میرے دل میں رہتی ہو،
اور مجھ سے کہتی ہو
اپنا خیال رکھنا۔۔۔۔۔۔
اور جب مجھے تیرا خیال آتا ہے
تو میں اپنا بہت خیال رکھتی ہوں

Zubaida Shakeel
321/100, Karnal Ganj
Kanpur-208001 (U.P)

لوگ کیا کہیں گے

سیدہ ایمن عبدالستار

" اپنی امرین تو سونے کی قلم سے تقدیر لکھوا کر لائی ہے امرین کو کیا ہی دیکھنا ہے ماشاءاللہ..!!" شاہین آپا نے خوشی سے ایک بھرپور نگاہ امرین کے سراپے پر ڈالی 38 سالہ امرین نے پیلے رنگ کا ایک خوبصورت ہلکے پھلکے ورک کا ڈریس زیب تن کیا تھا قیمتی و بھاری جیولری کو نفاست سے پہنے ہوئے وہ بالوں کے بندھے جوڑے کے ساتھ بے حد دلکش لگ رہی تھی شادی کے بعد یہ اس کی پہلی خاندانی تقریب تھی جس میں وہ امی اور بہنوں کے اصرار پر جبراً تیار ہو کر آئی تھی شاہین آپا کے لہجے کی مٹھاس لفظوں کی شیرینی سے وہ چونک کر انھیں حیرت و استعجاب سے چند لمحے دیکھتی رہی پھر یکایک وہ انھیں نظر انداز کر گئی اس کی نگاہیں دوسری طرف بھٹکنے لگیں۔

" ہاں بھئی ہماری امرین کے تو بھاگ جاگ گئے تقدیر نے بھی کیا پلٹا کھایا ہے..!" نجو آپا کے لہجے میں خوشی کے ساتھ ہلکا سا طنز بھی تھا جو امرین نے صاف محسوس کیا اس نے بمشکل اپنا چہرہ حیرت سے ہونقوں سا بننے سے روکا ہوا تھا وہ انھیں نظر انداز کر رہی تھی ان کی باتوں نے اسے اب الجھن میں ڈال دیا تھا یہ وہی خواتین تھیں جو کچھ سال پہلے اسے کہتی تھیں۔

" امرین کی کہیں کوئی بات چلی..؟؟ چھوٹا پچھلے ہفتہ کہہ رہا تھا کوئی رشتہ آیا تھا..!!" شاہین آپا نے کتنے دکھ بھرے لہجے میں امی سے پوچھا لیکن ان کی آنکھوں میں عجیب سی حقارت سمائی ہوئی تھی امی کا چہرہ اتر گیا خود امرین کے اندر تک اداسی چھا گئی اگر وہ کسی لڑکے اور اس کے گھر والوں کے معیار پر پورا نہیں اتر پاتی تو اس میں امرین کی کیا غلطی تھی اتنی اچھی تقریب کا مزا خراب کر دیا تھا۔

" ان کا ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا دیکھیں گے ان شاءاللہ کہیں نہ کہیں تو بات بن ہی جائے گی..!!" امی نے زبردستی مسکراتے ہوئے جیسے خود کو تسلی دی تھی امرین ایک خوبصورت متناسب جسم کی مالک خوش شکل سلجھی ہوئی لڑکی تھی کہیں حسن کی کمی کہیں قد کاٹھ کی الجھن کہیں جہیز کا مسئلہ کہیں خاندان کا تعلق ایسی کئی وجوہات اس کا رشتہ نہ جڑنے کا جواز بنتی رہیں تھیں۔

" اللہ تمہیں صبر دے ہائے یہ اولاد کے دکھ بچے چھوٹے ہیں تو تعلیم کی فکریں جوان ہیں تو شادی کا ٹینشن..!!" ہاجرہ خالہ نے سنجیدگی سے کہا۔

" آج کل لڑکیوں کی پرسنالٹی کا معیار بھی بہت بڑھ گیا ہے ذرا امرین پر تم بھی دھیان دیا کرو اچھا پہننے اوڑھنے سے بھی بندہ خوبصورت دلکش نظر آتا ہے..!" نجو آپا نے اپنے لہجے کی تلخی چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی پھٹ سے کہہ دیا امرین نے ہلکے پستہ کلر کا ہلکے ورک والا ڈریس زیب تن کیا ہوا تھا بڑے سلیقے سے دوپٹے کو سیٹ کیا تھا بڑے بڑے جھمکے پہنے مانگ ٹیکے کے ساتھ سادہ میک اپ کئے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی نجو آپا کے کہتے ہی اسے اپنا آپ محفل میں جوکر لگنے لگا ایسا محسوس ہونے لگا جیسے

سب کی تمسخرانہ نظریں اس پر ہیں اور سبھی زیر لب مسکرا رہے ہیں۔
" لڑکیوں کو ہر کام میں پرفیکٹ ہونا چاہیے..! نجو آپا نے اپنی بیٹی اقصیٰ کو نہارتے ہوئے کہا پچھلے مہینے ہی اس کی انگیجمیٹ بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اب وہ فل میک اپ میں سجی سنوری کسی تتلی کی مانند ساری محفل کو زعفران کئے ہوئے تھی امرین کو اقصیٰ کی قسمت پر رشک آنے لگا اچانک ہی وہ اس محفل سے بیزار ہو کر گھر واپس آ گئی۔
" ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے دل برداشتہ نہیں ہوتے بیٹا یہ سارے اللہ کے کام ہیں جہاں جس کا جوڑ ہے بات وہیں پکی ہوجائے گی یوں اداس نہیں ہوتے لوگوں کی باتوں کو دل پر نہیں لیتے حالات جیسے بھی ہوں اللہ پر بھروسہ رکھو اللہ سے تعلق قائم ہوجائے تو پھر انسان کے قول و فعل اور کردار و اخلاق میں تبدیلی آتی ہے، اور اُس کی مثبت سوچ سے اُس کا خاندان، معاشرہ اور پوری انسانیت فیض حاصل کرتی ہے۔ وہ بے ضرر اور فیض رساں بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے اللہ سے تعلق ضروری ہے۔ لہذا لازم ہے کہ پورے شعور و یقین کے ساتھ خدا کی وحدانیت کو تسلیم کر کے اسی سے اپنے لیے نیک اچھے شوہر کے لیے دعا کرو..!!" امی نے گھر آتے ہی اسے اپنے پاس بٹھا کر محبت سے سمجھایا امرین نے ماں کو گلے لگا لیا۔
کچھ سال بعد اس کی شادی ہوگئی وہ ایک نارمل ازدواجی زندگی گزار رہی تھی سسرال والوں کی شکایات تھی تو شوہر کی محبت نے اسے سنبھالا ہوا تھا شادی کے دوسرے سال ہی اولاد کے لیے سسرال والوں نے واویلا مچائی۔
" ہائے ری قسمت ایک تو اتنے سال انتظار کر کر کے شادی ہوئی اور اب اولاد کے لیے اتنا انتظار..!! امرین کی پھوٹی قسمت ہائے...!!" شاہین آپا نے امی کے کندھے کو ہمدردی سے تھپکتے ہوئے کہا امرین نے ناگواری سے انھیں دیکھا۔
" عورت تو مکمل اولاد سے ہوتی ہے اولاد کو پیدا کرنے والی ماؤں کے قدموں تلے جنت رکھ دی ہے اللہ تعالیٰ سے اتنا بڑا رتبہ ایک معمولی عورت صرف اور صرف اولاد کی وجہ سے پاتی ہے..!" ہاجرہ خالہ نے قدرے اونچی آواز میں کہا کہ شادی کی تقریب میں مشغول رشتہ دار خواتین ان کی طرف متوجہ ہوئیں امرین اپنے آپ کو زمین میں گڑا محسوس کرنے لگی عجیب سی شرمندگی اسے گھیرے ہوئے تھی علاج وہ دونوں ہی کر رہے تھے ہر ماہ اسپتال کا خرچ الگ تھا سسرالیوں کے طنز و طعنے تلخ باتیں سہہ سہہ کر اسے ڈپریشن ہونے لگا تھا شوہر بھی اس وقت بدل گئے جب لیڈی ڈاکٹر نے اسے مکمل "بانجھ" ڈیکلیئر کیا
" مرد کا کیا ہے گھر سے باہر نکلے تو دنیا کا..!!! اسے تو اولاد کی زنجیر سے باندھ کر رکھتی ہے عورت... عورت کی زندگی تو اولاد میں اس کی پرورش میں اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں کب گزر جاتی ہے پتہ بھی نہیں چلتا ...!" شمع پھوپھو نے سر ہلا کر تاسف سے ماں بیٹی کو دیکھا پھر ناگواری سے بولیں امی کا چہرہ اتر گیا تھا لیکن وہ بولی کچھ نہیں..!
" کاش....!! کاش... یہ اس کے ہاتھ ہوتا تو وہ کب کی ماں بن چکی ہوتی...!" اس نے دکھ و ملال کی آخری حد کو چھوتے ہوئے سوچا بہت سی باتیں انسان کو اندر ہی اندر جلاتی ہیں جو کبھی کسی سے نہیں کہی جاتیں وہی باتیں انسان کو کھا جاتی ہیں کھوکھلا کر دیتی ہیں اور کھوکھلے لوگوں کا ضبط کانچ کی چوڑیوں کی مانند ہوتا ہے کھنکتا ہے تو آنکھ نم کر دیتا ہے اور ٹوٹ جائے تو بہت کچھ ختم کر دیتا ہے اس کی ہمت وضبط ٹوٹا تو آنسو آنکھوں سے بہہ نکلے اور جو مجلس خوشی سے جھوم رہی تھی ایکدم افسردہ ہوگئی اس پر سچی جھوٹی ہمدردی کے دروا ہوگئے اور امرین اپنے دکھ کے چند آنسوؤں کو نہ روک پانے پر اپنا ضبط کھونے پر پچھتانے لگی جلد ہی وہ وہاں سے اٹھ گئی۔
" مجھے اس طرح سب خاندانی رشتہ داروں کے سامنے نہیں رونا تھا نہ.." گھر آئی تو امی کو افسردہ دیکھ کر وہ خود ہی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
" کوئی بات نہیں بیٹا..! تیرا دکھ بھی تو بڑا ہے سب کے رویوں نے تجھے توڑ دیا ہے اور آج کل بہت زیادہ حساس ہوگئی ہے ذرا سی ٹھیس پر تیرے آنسو نکلتے ہیں اپنے آپ کو سنبھالو بیٹا..!!" امی نے امرین کو اپنے قریب کر لیا محبت سے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہوئی خود ان کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں تھیں۔
" ہم تب تک نہیں سیکھتے جب تک چیزیں آسان اور سہل ہوتی ہیں ہم تب سیکھتے ہیں جب حالات مشکل ہوجاتے ہیں اور راستے ہمیں خود بنانے ہوتے ہیں تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا یوں ذرا ذرا سی بات پر دل ہلکا مت کرو..!!! اللہ پر بھروسہ رکھو میری بچی اولاد اور رزق صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم رکھتا ہے وہی مالک کل ہے..!" امی اسے چاہت سے سمجھا رہی تھیں۔
" میں تو کوشش کرتی ہوں اللہ سے جڑی رہوں پانچ وقتہ نماز پڑھوں دیگر دینی باتوں کا خیال رکھوں..! تو کیا میں گنہگار بندی ہوں جو اللہ نے مجھے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہے اس میں میرا کیا قصور ہے امی..! جو لوگ مجھ پر اتنی انگلیاں اٹھاتے ہیں..!!" امرین سیدھی ہو کر بیٹھی اور پوچھنے لگی۔

"لوگوں کا رویہ لوگوں کی باتیں تو وقت و حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں کل تک یہی لوگ عامر سے تمہاری شادی پر رشک و حسد کر رہے تھے آج یہی لوگ تمہاری کمیوں اور خامیوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں..!!میں یہ سمجھانا چاہ رہی ہوں میری بچی لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو راضی رکھو اسی میں دین، دنیا اور آخرت کی بھلائی پوشیدہ ہے..!" امی اس کے چہرے پر آئی لٹوں کو پیچھے اڑستے ہوئے پیار سے بولیں وہ کچھ لمحے انھیں دیکھتی رہی پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کی گود میں سر رکھ گئی۔

امرین نے شادی کے مشکل اور دکھ بھرے نو سال اسی امید پر گذارے تھے کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور وہ اولاد کے سکھ سے نوازی جائے اس نے بڑے سے بڑے اسپتال میں اپنا علاج کروایا دعا، دوا، درگاہ، مزار کچھ بھی نہیں چھوڑا لیکن جو تقدیر میں نہیں وہ چیز کہاں سے مل سکتی ہے عامر نے والدین اور بہنوں کے دباؤ میں آکر اور خود اپنی اولاد نرینہ کی خواہش کو مکمل کرنے کے لیے دوسری شادی کر لی اور امرین کو طلاق دے دی۔ امرین کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا کئی دنوں تک امرین کی امی نے یہ بات چھپا کر رکھی لیکن زیادہ دن یہ راز چھپا نہ رہ سکا ایک دن کھل گیا امرین پھر سے خاندان بھر میں ایک بحث کا موضوع بن کر رہ گئی

"پریشانیاں ہر ایک کی زندگی میں موجود ہیں کوئی بھی ایک مکمل پرفیکٹ زندگی نہیں گزار رہا ہے بس فرق وہاں پر آتا ہے جہاں انسان اپنے سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے مطمئن ہو جاتا ہے..!" امی کی حوصلہ افزا باتوں سے وہ اب تک زندہ تھی ڈپریشن سے دور ایک نارمل زندگی گذار رہی تھی اس نے عالمہ کورس کے لیے داخلہ لیا اور خود کو دینی کاموں میں درس و تدریس کے فرائض میں مشغول کرنے لگی وہ ہر حال میں اپنے رب کی شکر گذار بندی بن کر رہنا چاہتی تھی۔ دنیا کی رنگینیوں سے اس کا دل اُچاٹ ہو گیا تھا لیکن اس کے والدین اب بھی اس کی دوسری شادی کے لیے کسی نیک صفت شخص کی تلاش میں تھے جبکہ امرین نے صاف طور سے منع کر دیا تھا لیکن امی بضد تھیں وہ بھی امی کی ضد کے سامنے جلد ہی خاموش ہو گئی۔

یوں تو رشتے آتے ہی رہتے تھے لیکن پچاس سالہ رشید صاحب کا رشتہ امرین کی امی سمیت پورے گھر والوں کو بھی پسند آیا رشید صاحب اپنی عمر سے زیادہ جوان اور چاک و چوبند نظر آتے تھے حال ہی میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں شہر میں ان کا گھرانہ امیر ترین اور مشہور تھا سب بچے شادی شدہ تھے انھیں ایک خدمت گذار و وفا شعار ساتھی کی ضرورت تھی اور ایک شرط یہ بھی تھی کہ دوسری بیوی سے انھیں کوئی اولاد نہیں چاہیئے تھی انھوں نے امرین کو اسی لیے پسند کیا تھا کہ وہ "بانجھ" ہے اور کبھی بھی ماں نہیں بن سکتی۔

"ماشاءاللہ سے دو بہویں دوڑ دوڑ کر امرین کی خدمت کرتی ہیں پوتے پوتیاں ایک منٹ تنہا نہیں چھوڑتیں شوہر نے سر کا تاج بنا رکھا ہے بیٹیاں برس کے برس آتی ہیں بچوں کے ساتھ تو ماں کے نخرے الگ اٹھاتی ہیں---

"مال دولت عزت شہرت اس کے گھر کی باندی ہے---بھئی واہ قسمت ہو تو امرین کے جیسی..! پلے پلائے بچے خدمتوں کے لیے مل گئے.!" شمع پھوپھو اور ان کی بہو اس کی زندگی پر رشک کر رہے تھے وہ اتنے دنوں بعد سج سنور کر تقریب میں آئی تھی یہ وہی لوگ تھے جن کی باتوں نے اس کی راتوں کی نیند اڑا دی تھی اس کے والدین بدنامی کے دلدل میں پھنس گئے تھے اب ان کی باتیں امرین کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔

"امی چلیں..!! ایسے لوگوں کی باتوں پر کیا دھیان دینا حالات بدلتے ہی ان کی نظریں بدل جاتی ہیں..! آئیں..! ربو خالہ کو مبارکباد دیتے ہیں..!" امرین نے ناگواری سے ان خواتین کو دیکھا اور امی جو ان کی باتیں انہماک سے سن رہیں تھیں ان کا ہاتھ تھام کر اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

□□□

Syeda Aiman Abdus Sattar
Al-Hayat Apartments
Flat No.1,Riyaz Colony
Take Nagar, Amba Jogai Road
Latur-413531 (M.S)
sayyedaaayeman@gmail.com

اپیل

ماہنامہ خواتین دنیا آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے اپنی گرانقدر رائے سے ضرور نوازیں۔ میگزین میں شائع ہونے والے مضامین، عنوانات اور مختلف ادبی شخصیتوں کی نشاندہی کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کریں تاکہ رسالے کو مزید بہتر بنانے میں ہمیں مدد مل سکے۔ (ادارہ)

افسانہ

انصاری شاہین عبدالحکیم

چہل قدمی

دن بھر کی مصروفیات کے بعد، تھکا ماندہ گھر پہنچتا ہوں، سکونِ زندگی تلاش کرتے ہوئے عشاء کی نماز کے لیے نکل پڑتا ہوں۔ فراغتِ نماز کے بعد خود کو ڈھونڈتا ہوا، چہل قدمی کرتا پھرتا ہوں۔ دورانِ چہل قدمی میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کیسا موحول ہے؟ زندگی ایک دھوکا ہے، دھوکے میں الجھے ہوئے سب اپنی اپنی زندگی کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں جیسے کسی کو کچھ معلوم نہیں ۔ ہر شخص یہاں بھٹک رہا ہے۔ ماحول دیکھ رہا ہوں میں۔ ماحول میں دو مختلف فرقے، دونوں بھی ایک آدم اور ایک حوا کی اولاد۔ مذاہب مختلف، تہذیبیں جدا جدا، دن الگ، رات مختلف۔ یہ ہندو تو وہ مسلمان! میں نے دیکھا ہے مسلمانوں کو غیر اسلامی طریقے پر عمل کرتے ہوئے۔ ہندوؤں نے اپنا لیے اسلامی طور طریقے، لیکن ان کو علم نہیں ہے کہ یہ طریقے اسلامی ہیں، پھر بھی، چہل قدمی کے دوران میں نے دیکھا ہے کہ اپنائے ہندوؤں نے مسلمانوں کے اصول ان کے علاقے میں، میں نے سکون ہی سکون دیکھا۔

سب اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ تمام بچے رات کے وقت گھروں میں پڑھنے میں مشغول ہیں۔ کچھ بچے سکون کے ساتھ آنکھ مچولی جیسے کھیلوں میں مگن ہیں۔ اُن کے علاقے شوروغل سے بے گانے ہیں جہاں میں سکون محسوس کرتا ہوں چہل قدمی کرتے کرتے۔ جب میں آتا ہوں مسلمانوں کے علاقے میں، یہاں میں نے نفسانفسی کا عالم پایا، قیامتِ صغریٰ کے سے مناظر، میں نے دیکھا کہ سکون جیسا کچھ بھی نہیں ہے یہاں۔ ایک طرف راستے پر پکوان ہی پکوان بنتے ہیں، میلے ٹھیلے عام ہیں اِن علاقوں میں۔ میں نے دیکھا کہ لوگ مسجد میں کم ،سڑکوں پہ زیادہ رہتے ہیں، بچے پان بیڑی، سگریٹ بزرگوں کے

سامنے پھونکتے ہیں، میں نے دیکھا بیشتر بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کو پان گٹکا کھا کر آس پاس ہی پچکاری مارتے ہوئے، میں نے دیکھا دیگچیاں راستوں میں چڑھی ہوئیں، چہل پہل، شوروغل، سب کچھ ہوتا ہے یہاں، گندگی دیکھی میں نے اِن علاقوں میں، موسیقی زوروں سے بجاتے ہیں یہ۔ شاعر کیا خوب کہتا ہے:

ع ہر اک مثبت عمل سے تم یہاں انکار دیکھو گے

اُس کا جملہ سن کے میں حیران ہوگیا، کہتا ہے ،وہ تو مُردوں کی ہے جگہ، یہاں دیکھو، رات کے تین بجے تک جاگتے ہیں ہم ،محفلیں سجتی ہیں ہماری، پُر رونق ماحول رہتا ہے ہمارا، یہ زندوں کی ہے بستی۔ میں نے کہا تمھاری عقل پر پتھر پڑے ہیں، شیطانی پردے پڑے ہیں اور نکل بھاگا وہاں کے ماحول سے ،سامنے کی بستی کا ماحول پُر سکون تھا، چہل قدمی کرتے ہوئے، ہندوئوں کا ایک لیڈر مل گیا مجھ سے، کہنے لگا میں آپ کو جانتا ہوں سر، آپ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہیں، روزآنہ رات میں چہل قدمی کرتے ہیں، اُس کے ہم راہ ہوگیا میں بھی، وہ کہنے لگا مجھ سے، کبھی ہمارے علاقے میں آپ بھی کچھ سکھانے آئیے ،میں بے خودی میں پوچھ بیٹھا، کیا کمی ہے آپ کے ماحول میں؟، وہ کہتا گیا میں سنتا گیا، کہنے لگا مجھ سے ،ہم تو ہر ہفتے درس دیتے ہیں، بڑے بڑے اسکالرز کو ڈھونڈ لاتے ہیں یہاں، ہفتہ واری لکچرز ہوتے ہیں۔

غلاظت کا یہاں انبار دیکھا ہے، جوان، بچے، بوڑھے سبھی بے کار نظر آتے ہیں، عورتیں بازار کی زینت بنی ہوئی ہیں، کیسا یہ ماحول ہے؟، کیسا یہ ماحول ہے؟؟ میرا سکون غارت ہوتا ہے یہاں۔ میں بھاگ نکلنا چاہتا ہوں، دیکھ کر ان کو تناؤ میں، گم ہوجاتا ہوں میں، فکر ان کی ستاتی ہے مجھے۔ ان کے ماحول سے گھبراتا ہوں میں۔ میں نے سنا تھا اور پڑھا بھی تھا کہ، سکوں ملتا ہے مسلمانوں میں، لیکن سکینہ برستی نہیں ایسے ماحول میں۔ چہل قدمی کرتے ہوئے، بھاگتا ہوں میں یہاں سے۔ کسی نے ایک روز مجھ سے پوچھا، کیوں بھاگتے ہو تم یہاں سے؟، کیوں چلے جاتے ہو، چہل قدمی کے لیے غیروں کے یہاں؟ میں نے کہا وہاں سکون ملتا ہے مجھے، شوروغل نہیں ہوتا وہاں، اُس کا جملہ سن کے میں حیران ہوگیا، کہتا ہے، وہ تو مُردوں کی ہے جگہ، یہاں دیکھو، رات کے تین بجے تک جاگتے ہیں ہم، محفلیں سجتی ہیں ہماری، پُر رونق ماحول رہتا ہے ہمارا، یہ زندوں کی ہے بستی۔ میں نے کہا تمھاری عقل پر پتھر پڑے ہیں، شیطانی پردے پڑے ہیں اور نکل بھاگا وہاں کے ماحول سے، سامنے کی بستی کا ماحول پُر سکون تھا، چہل قدمی کرتے ہوئے، ہندوؤں کا ایک لیڈر مل گیا مجھ سے، کہنے لگا میں آپ کو جانتا ہوں سر، آپ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہیں، روزآنہ رات میں چہل قدمی کرتے ہیں، اُس کے ہم راہ ہوگیا میں بھی، وہ کہنے لگا مجھ سے، کبھی ہمارے علاقے میں آپ بھی کچھ سکھانے آئیے، میں بے خودی میں پوچھ بیٹھا، کیا کمی ہے آپ کے ماحول میں؟، وہ کہتا گیا میں سنتا گیا، کہنے لگا مجھ سے، ہم تو ہر ہفتے درس دیتے ہیں، بڑے بڑے اسکالرز کو ڈھونڈ لاتے ہیں یہاں، ہفتہ واری لکچرز ہوتے ہیں۔ پہلے دو ہفتے بزرگوں کو دیتے ہیں، دوسرے دو ہفتے جوانوں کے لیے ہوتے ہیں درس، پھر بڑھتے ہیں بچوں کی طرف ہم، اُن کے لیے بھی بلاتے ہیں اسکالرز کو تعلیم سے ہی معیار بڑھتا ہے سر، ہم اپنے لوگوں کو سکھانا چاہتے ہیں۔، امانت داری، دیانت داری، تہذیب، رواداری اور ادب۔، ورنہ سب غافل ہوجائیں گے، بچے بڑوں سے، بڑے بچوں سے، ہمارا معاشرہ بھٹک جائے گا، کوئی تعلیم یافتہ نہ رہ پائے گا، کوئی تہذیب یہاں نہ ہوگی، ماحول

جنگل میں بدل جائے گا، اگر ہم ان کے ذہنوں کو رونق نہ بخشیں گے تو سب کچھ یہاں سے ختم ہو جائے گا۔

اسی طرح کی محنت ہم کرتے ہیں یہاں، یہ سنتے ہی میں چکرا گیا، اتنی محنت کرتے ہیں یہ لوگ۔ انھوں نے ہمارے طریقے اپنائے ہیں، ہم نے اپنے طریقے ٹھکانے ہیں، سوچ کی لہروں میں گم ہو گیا ہوں میں۔ کیا سوچوں اور کیا بولوں؟ بے بس ہو گیا ہوں میں، میری چُپی دیکھ کر اُس نے کہا، چلیے چائے پیتے ہیں کہیں۔ میں اُسے لے بڑھا چائے والے کی طرف، اُس نے کہا یہاں نہیں سر، پیچھے گلی میں چلتے ہیں، پیچھے کی گلی پہنچتے ہیں، اُس نے چائے منگوائی، میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا، اُس گلی میں چائے پینے سے انکار کیوں کیا، آپ نے؟ کہنے لگا، ہم نے چائے کی دکانوں کے اوقات بانٹ رکھے ہیں سر، بزرگوں کے سامنے ہمارے بچے چائے سگریٹ پیئں، یہ ہمیں گوارا نہیں، اس لیے ہم نے طے کیا ہے یہ، کہ جب اُس دکان پر بزرگ ہوں گے، تو اُس پر نوجوان نسل نہیں ہوگی، جب اِس پر نئی نسل ہوگی، تو اس دکان پر اس وقت بزرگ نہیں جائیں گے، ہم اس طریقے سے بھی تہذیب سکھاتے ہیں انھیں، یہ ہمارا ماحول ہے، باتوں باتوں میں اس نے پوچھ لیا، آپ کا گھر اُس محلے میں ہے تو، آپ یہاں کیسے؟ میں نے خجالت سے کہا، چہل قدمی کرنے آجاتا ہوں یہاں، وہ کہنے لگا یہاں کیوں بھلا؟ میں نے کہا یہاں سکوں ملتا ہے مجھے، وہاں شور وغل بہت ہوتا ہے بھائی، بے ساختہ قہقہہ لگا دیا اس نے اور کہنے لگا، برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟

بہت گنہگار ہیں آپ سر، اُس کا یہ جملہ سنتے ہی میں بری طرح بکھر گیا، چائے ختم کرتے ہی، ہم دونوں ایک جانب بڑھنے لگے، اُس نے پوچھا کیا ہوا سر؟ آپ پریشان ہو گئے، میں نے کہا: میں گنہگار ہوں یہ جملہ تیر کی طرح چبھ رہا ہے مجھے، وہ کہنے لگا سر وہاں کا ماحول کس قدر خراب ہے، وہاں لوگ کہتے ہیں صفائی نصف ایمان ہے، پر وہ علاقہ جانا جاتا ہے اس نام سے، جہاں مسلمان ہوتے ہیں گندگی وہاں موجود ہوتی ہے، اور جہاں غلاظت ہو تو سمجھ لیجیے، کہ یہ مسلمانوں کا محلّہ ہے، کیسا معاشرہ ہے یہ کہ جو دیر رات تک، تفریحِ نفس میں مشغول رہتا ہے، صبح فجر سے پہلے سوتے ہیں، جب آپ کی قوم کو اُٹھنے کا حکم دیا گیا ہے قوم نے اس وقت کو سونے کے لیے بنا رکھا ہے، یہ کیسا ماحول ہے کہ باپ کے منہ پے بیٹا سگریٹ پھونکتا ہے، لوگ راستوں سے بھٹکتے دکھتے ہیں مجھے، جب موذن اذان دیتا ہے، بے ادب لوگ اُس وقت بھی، مسری کرتے ہوئے دکھتے ہیں مجھے، اس لیے آپ گنہگار ہیں سر، آپ تو بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں سر، کون کرتا ہے محنت اُس علاقے پر؟ کوئی فکر کرتا ہی نہیں نوجوان نسل کی، بکھرے رہتے ہیں سب کے سب وہاں، تعلیم کو چھوڑ کر، تہذیب کو کوڑے میں پھینک کر، دین کو بھلا کر، کیسے رہتے ہیں یہ؟ اس لیے آپ گنہگار ہیں سر! میں نے کہا: یہ ریت کی مانند مٹھی سے پھسل چکے ہیں، وقت نکل گیا ہے، ان پر محنت برسوں پہلے ختم کر دی گئی ہے، یہ اب ایسے ہو گئے ہیں، جیسے کانچ کے بکھرے ہوئے ٹکڑے، ان کو یک جا کرنے جائیں بھی تو کیسے؟

یہ کانچ کے ٹکڑے ہیں، پل بھر میں سب کو زخمی کر دیں گے، میرا ایماں کہتا ہے مجھ سے، ان کے ایسے اعمال پر آپ جب کچھ کر نہ سکیں تو کم سے کم دل ہی میں بُرا جانیے ان کے اعمال کو، خدا سے مانگیے ہدایت ان کے لیے، اس چہل قدمی کے دوران، رابطہ قائم رہتا ہے میرا خدا سے، ان کے تعلق سے باتیں کرتے ہوئے، میری چہل قدمی ہوتی ہے، صرف ان کے لیے یہ چہل قدمی کرتا ہوں میں، خود کو مجرم گردانتا ہوں میں کہ بزدل، کم زور، ڈرپوک اور کم ہمت ہوں میں کہ کوئی عملی قدم اٹھانے سے گھبراتا ہوں۔

□□□

Ansari Shahin Abdul Hakim

(Lecturer)

Al-Ittehad Jr.College, R.M.Road, Gulshan Nagar, Jogeshwari(West)

Mumbai - 400 102.(M.S)

+91 9820775198

"امی میں آپ سے کہہ رہی ہوں میں نے روحیل کے موبائل میں ایک لڑکی کی تصویر دیکھی ہے" مناہل گذشتہ ایک ماہ سے اپنی ماں زینب سے یہ بات کہہ رہی تھی البتہ زینب اس کی بات کا یقین نہیں کر رہی تھی مناہل یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ وہ اپنی امی کو یہ بات کیسے بتائے وہ جانتی تھی کہ روحیل کسی اور لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہے یہ بات اسے کسی نے بتائی نہیں تھی اس نے خود اپنا جاسوسی

دماغ لگا کر یہ بات پتا کی تھی۔اسی لیے زینب اس کی بات کا یقین نہیں کر رہی تھی ۔اسے لگ رہا تھا مناہل جھوٹ کہہ رہی ہے تا کہ اسے روحیل سے شادی نہ کرنا پڑے ۔لیکن مناہل کے لیے یہ سچ سامنے آنا بے حد ضروری تھا۔کیونکہ گھر میں روحیل اور مناہل کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھی اور کچھ دنوں بعد شادی تھی ۔روحیل اور مناہل کا رشتہ بچپن میں ہی طے ہو چکا تھا۔روحیل مناہل کے ماما کا لڑکا تھا۔۔۔"امی میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔" زینب اس کی بات پر بھڑک اٹھی اور کہا" روحیل سے شادی ہو جائے گی تو دیکھنا تمھاری زندگی کتنی خوبصورت ہو جائے گی۔۔۔۔۔

"خوبصورت؟۔۔۔۔۔امی میری زندگی خوبصورت نہیں برباد ہو جائے گی پلیز میری بات کا یقین کریں۔۔۔۔میں نے خود دیکھا ہے روحیل کسی لڑکی کے ساتھ تھا میں نے ان دونوں کے فوٹوز دیکھے ہیں۔" زینب اس کی ہر بات کو جھوٹ ہی سمجھ رہی تھی۔۔۔۔"میں تم سے آخری بار کہہ رہی ہوں مناہل روحیل پر ایسے جھوٹے الزمات مت لگاو میں اسے جانتی ہوں وہ ایسا کبھی کر ہی نہیں سکتا،تمھارے ماما اور ابو نے مل کر یہ بات طے کی تھی اور یہ بات روحیل سے چھپی تھوڑی ہے۔۔۔اس نے کبھی ہمارے سامنے یہ نہیں کہا کی وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے یا اسے تم پسند نہیں ہو۔اور وہ کسی اور کو کیوں پسند کرے گا تم میں ایسی کوئی کمی نہیں ہے بیٹی۔۔ ماشاءاللہ میری بیٹی بے حد خوبصورت ہے،تعلیم یافتہ ہے،امور خانہ داری بھی بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ایسی کوئی وجہ نہیں ہے میری بچی۔۔ اپنے ذہن سے ایسے خیالات نکال دو، سب ٹھیک ہے۔"

وہ اسے سمجھا کر کمرے سے چلیں گیں ۔۔۔ مناہل بہت پریشان تھی کہ یہ سچ سب کے سامنے کیسے لائے کبھی کبھی تو وہ دن بھر روتی رہتی اپنے کمرے میں بند رہتی۔اور ایسے ہی دن گزرنے لگے اور نکاح کا دن پلک جھپکتے ہی آ گیا مناہل کے ابو اور امی بے حد خوش تھے کے آج بیٹی کا نکاح ہے۔اور دوسری طرف وہ رو رو کر نڈھال ہو چکی تھی۔کسی طرح وہ چپ ہوئی اور اسے تیار کیا گیا۔دلہن بنی ہوئی وہ بے انتہا خوبصورت لگ رہی تھی۔۔۔۔اس کا دل کر رہا تھا کے اپنے ابو "جاوید مرزا" سے بات کرے مگر وہ اتنے خوش تھے،مناہل کا دل نہیں کیا کہ وہ یہ سب بتا کر اس کے ابو کی خوشی کو غم میں بدل دے۔وہ چپ رہ گئی ۔۔۔اور پھر گھر سارا مہمانوں سے بھر گیا نکاح کو بس کچھ ہی دیر باقی رہ گئی تھی مگر اب تک روحیل کا کوئی پتا نہیں تھا روحیل کے والدین بھی آ چکے تھے اور ان کا کہنا تھا کی روحیل دوسری گاڑی میں اپنے دوستوں کے ساتھ آ رہا ہے۔کافی دیر ہو گئی روحیل نہیں آیا سب اسے فون کرنے لگے مگر اس کا فون بند تھا۔زینب بہت گھبرانے لگی اسے لگا کی ابھی مناہل کو سب مہمانوں کے درمیان لے کر آنا درست نہیں ہوگا اسی لیے زینب نے اسے کمرے کے اندر ہی رہنے دیا۔کئی گھنٹے گزر گئے روحیل کا کوئی اتا پتہ نہیں تھا روحیل کے والدین بہت فکر مند ہونے لگے کی نہ جانے وہ کہاں ہے۔۔۔اچانک سے روحیل کے ابو کے فون پر روحیل کا فون آیا انھوں نے جلدی سے فون اٹھایا،فون پر روحیل نے جو کہا وہ سن کر ان کے ہوش باختہ ہو گئے انھیں گھبراہٹ کے مارے پسینہ آنے لگا انھیں سمجھ نہیں آیا کے وہ یہ بات سب کو کیسے بتائیں انھوں نے روحیل کی امی اور مناہل کے والدین کو ایک طرف بلا کر یہ کہا۔

"زینب روحیل نے ابھی فون کیا تھا۔یہ سن کر وہ جھٹ سے بولیں۔" کیا کہا اس نے، کہاں ہے وہ؟؟۔۔۔اسے کہیں جلدی پہنچے

سارے مہمان آ گئے ہیں لوگ انتظار کر رہے ہیں۔" روحیل کے ابّو نے ندامت سے اپنی بہن زینب سے کہا۔

"زینب روحیل نے کہا کہ اس نے ابھی ابھی۔۔۔۔۔کسی لڑکی سے۔۔۔نکاح کر لیا ہے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولے تو جاوید مرزا اور زینب پر آسمان ٹوٹ پڑا۔۔۔

"آپ کا دماغ ٹھیک تو ہے بھائی جان، یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟؟۔۔۔یہ ہماری بیٹی کی زندگی کا سوال ہے۔۔۔۔آج نکاح ہے گھر بھر میں مہمان ہیں اور۔۔۔اور آپ کہہ رہے ہیں کہ روحیل نے نکاح کر لیا۔۔ اسے کسی اور سے نکاح کرنا ہی تھا تو میری بیٹی سے شادی کرنے کے لیے اس نے ہامی کیوں بھری۔؟"

زینب بے حد غصّے میں روتے ہوئے اپنے بھائی سے کہنے لگی مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔مناہل کے ابّو سر تھام کر بیٹھ گئے کہ اب کیا ہوگا ان کی بیٹی کا۔۔۔اتنے سارے مہمانوں کو کیسے کہے کہ دولہا کسی اور لڑکی سے نکاح کر چکا ہے روحیل کے امی ابّو جاوید مرزا سے معافی مانگنے لگے۔۔۔لیکن اب معافی سے کیا ہونا تھا۔۔۔۔زینب رو رو کر جاوید سے کہنے لگی۔

"میری بچی مجھے کتنے وقت سے کہہ رہی تھی کہ امی روحیل کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہے میں نے اس کے فون میں کسی لڑکی کی تصویر دیکھی ہے مگر میں نے اس کا یقین نہیں کیا مجھے لگا کہ وہ جھوٹ کہہ رہی ہے مجھے لگا کہ وہ بہانے بنا رہی ہے تاکہ اسے روحیل سے شادی نہ کرنا پڑے" جاوید مرزا یہ سب سن کر سرد سے پڑ گئے اور کہا۔

"تم یہ سب مجھے اب بتا رہی ہو زینب۔۔۔یہ سب اگر مجھے پہلے ہی بتا دیتی تو میں یہ نکاح پہلے ہی روک دیتا۔۔۔۔اب جو بدنامی ہوگی، کیا اسے ہماری بیٹی جھیل پائے گی۔۔؟؟" جاوید مرزا اپنے غصّے اور جذباتی ہوتے دل پر قابو کرتے ہوئے بولے۔"تم سے غلطی ہوئی ہے زینب، اگر تمھیں پتا تھا کہ مناہل روحیل سے نکاح نہیں کرنا چاہتی تو تم نے اس بات کو مجھ سے کیوں چھپایا اس کے ساتھ زبردستی کیوں کی۔۔۔" زینب کے پاس اب پچھتانے کے علاوہ اور کوئی چیز باقی نہیں تھی۔۔۔۔مہمان انتظار کے بعد طرح طرح کی باتیں بنانے لگے اور آخر کو روحیل نے کسی اور لڑکی سے نکاح کیا یہ بات سب کے سامنے آ گئی لوگوں نے ڈھیروں باتیں کرنا شروع کر دیں جیسے تیسے کر کے مہمان چلے گئے گھر خالی ہو گیا مناہل کی کزن نے اسے وہ سب بتایا کہ روحیل نے کیا کیا اور سارے مہمان جا چکے ہیں۔ مناہل سکتے کے عالم میں چلی گئی۔

"میں نے کہا تھا امی سے مگر امی نے میرا یقین نہیں کیا۔" مناہل خود ہی بڑبڑانے لگی تب ہی اس کی امی روتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئی دیکھا تو مناہل دلہن بنی ہوئی بالکل چپ بیٹھی تھی۔زینب نے آ کر اسے گلے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔لیکن مناہل بالکل چپ تھی۔

"کچھ تو بول میری بچی ایسے چپی کیوں سادھی ہے رو لے دل ہلکا کر لے لیکن ایسے چپ مت رہ۔"

"کیا کہوں امی اور کس لیے روؤں اس روحیل کے لیے؟؟ اس سے تو مجھے یہی توقع تھی، برا تو مجھے اس بات کا لگ رہا ہے کہ میری امی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔" زینب اس کے منہ سے یہ سن کر بہت روئی۔

"مجھے معاف کر دے میری بچی مجھ سے غلطی ہوگئی...مجھے تیری بات پر یقین کر لینا چاہیئے تھا میری وجہ سے آج میری بچّی کو یہ دن دیکھنا پڑا.."

مناہل بالکل چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی...پھر کچھ دیر بعد بولی....

"امی......میری طبعیت ٹھیک نہیں لگ رہی...میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں..."

"ہاں بیٹا تم آرام کرو۔" وہ مناہل کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں اور مناہل نے اپنا نکاح کا جوڑا بدل کر اپنی امی کو تھما کر کہا....

"یہ جوڑا لے جائیں امی.... اور انھیں کو دے دیں جس کو یہ علم ہی نہیں کہ ان کی اولاد ان کے پیٹھ پیچھے کیا کر رہی تھی...مجھے ان کا لایا ہوا کچھ نہیں چاہیئے..."

اتنا کہہ کر وہ اپنے بیڈ پر لیٹ گئ اور زینب چپ چاپ اس جوڑے کو دیکھنے لگی۔۔۔کیا سوچا تھا اور کیا ہو چکا تھا۔زینب کا دل اپنی بیٹی کے لیے بے حد پریشان تھا اس کا نکاح ٹوٹنے پر اب اس کا نکاح کیسے ہوگا اور کون اس سے نکاح کرے گا، اس قسم کے سوالات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔

ایسے ہی کچھ دن گزرے مناہل نے کالج جانا پھر سے شروع کر دیا تھا۔البتہ زینب اب تک اسی بات کی فکر میں تھی کہ مناہل سے نکاح کون کرے گا۔۔۔کالج میں مناہل کی کلاس کی لڑکیوں نے مناہل کا مذاق بنانا شروع کر دیا تھا کہ اس کا نکاح ٹوٹ گیا ہے۔۔۔مگر مناہل نے ان سب کی باتوں کو نظر انداز کیا۔ایک دن وہ تھکی ہوئی کالج سے گھر پیدل آ رہی تھی تب راستے میں اسے روحیل نظر آیا جو کسی دکان سے گھر کا سامان خرید کر اپنی گاڑی میں رکھ رہا تھا اس کی نظر جیسے ہی مناہل پر پڑی وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔۔۔اسے دیکھ کر مناہل کا خون کھول گیا اور وہ وہاں سے

برق رفتار سے جانے لگی تب روحیل اسے آواز لگا کر بولا۔۔۔۔

"مناہل رکو۔"

مگر مناہل نے ایک نہیں سنی اور وہ تیز قدموں سے جانے لگی۔وہ بھی دوڑتا ہوا اس کے پیچھے آیا اور اس کے آگے آ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔اس کی یہ حرکت پر مناہل غصّے سے سرخ ہو گئی۔

"مناہل میری بات سنو میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت غصّہ ہو پر میری بات تو سنو۔"

ایک خوبرو شخص جو بائک پر ہیلمٹ پہنے سوار تھا مناہل کو دیکھ کر اس نے بائک روکی پر وہ بائک سے اترا نہیں اس نے اپنے لمبے پیر زمین پر ٹیک دیئے اور ہیلمٹ اتار کر مناہل کو غور سے دیکھا اور کچھ سیکنڈ بعد مسکرایا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اس نے دیکھا کہ مناہل بہت غصّے میں کسی سے بات کر رہی تھی۔۔۔

"ہٹو میرے راستے سے مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی، نہ تمھاری کوئی صفائی سننی ہے"۔۔۔۔

"مناہل مجھے معاف کر دو مجھ سے غلطی ہو گئی میں نے تمھیں چھوڑ کر کسی اور لڑکی سے نکاح کیا مجھے اس بات کی سزا بھی مل چکی ہے، وہ لڑکی فراڈ تھی وہ اتنے وقت سے مجھ سے صرف جھوٹ کہتی رہی کہ وہ مجھ سے شادی کرے گی مگر میں بیوقوف تھا جو اس کی باتوں میں پھنس گیا نکاح کے دن ہی وہ اپنے گھر سے اپنے تمام زیورات اور ابّو کے لاکر سے تمام پیسے چرا کر بھاگ گئی"۔۔۔۔

مناہل وہ سب سن کر حیران تو ہوئی مگر اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔۔

"تو اب تم کیا کہنا چاہتے ہو، میں اپنے ابّو کو واپس سے نکاح کی تیاریاں کرنے کو کہوں۔۔۔اتنے برے دن نہیں آئے ہیں ہمارے۔۔۔ اور تمھیں کیا لگا کہ میں تمھارے کسی اور لڑکی سے نکاح کرنے پر ماتم مناؤں گی۔۔۔ ہرگز نہیں، مجھے تو تمھارے سارے راز پہلے سے پتا تھے میں تو امی کو کب سے کہہ رہی تھی کہ مجھے تم سے نکاح نہیں کرنا ہے مگر امی کو لگا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں تا کہ مجھے تم سے نکاح نہ کرنا پڑے انھیں تم پہ مجھ سے زیادہ بھروسہ تھا۔۔۔مجھے صرف اسی بات کا برا لگا تھا کہ میری امی مجھے نہیں سمجھ پائی ،باقی تم جیسے انسان کے لیے کون روئے گا۔۔۔۔روحیل اس کی باتوں پر آنکھیں پھاڑے حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔اور وہ بائک سوار بھی ان کی باتوں کو سن کر شروع میں تو بہت حیران ہوا البتہ مناہل کی بے خوف باتوں پر مسکرانے لگا۔۔مناہل وہاں سے جانے لگی تب اس کی نظر اس بائک سوار پر پڑی جو اسے دیکھ کر بڑے دلکش انداز میں مسکرا رہا تھا۔۔وہ کچھ دیر حیران رہی مگر اسے دیکھ کر سوچنے لگی کہ اسے کہیں تو دیکھا ہے مگر اسے یاد نہیں آیا اور وہ گھر کی سمت چلی گئی وہ بائک سوار حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھنے لگا کہ مناہل نے اسے پہچانا نہیں۔۔۔وہ تو گھر چلی گئی اور روحیل مناہل کی باتوں سے سکتے کے عالم میں تھا۔۔۔۔۔

اگلی شام 4 بجے مناہل اپنے کمرے میں بیٹھے، بیٹھے بور ہو گئی تھی اس نے سوچا جا کر شام کی چائے کے ساتھ کچھ سموسے بنا لے اپنی امی ابّو کے لیے۔وہ کچن میں گئی اور اپنی امی کو کچن سے باہر جا کر اپنے ابّو کے ساتھ بیٹھنے کو کہا۔۔۔

"مناہل میں بھی مدد کرتی ہوں کام جلدی ہو جائے گا۔"

"نہیں امی آپ ابّو کے ساتھ بیٹھئے میں کر لوں گی۔" اس کے اصرار پر زینب باہر چلی گئی۔۔۔مناہل نے جلدی جلدی سموسے اور چائے بنائی اور صحن میں جیسے ہی آئی اس نے دیکھا اس کے ابّو امی کے ساتھ وہی لڑکا بیٹھا تھا جو کل بائک پر اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا وہ تعجب میں پڑ گئی کہ یہ ہے کون جو اس کے گھر تک آ گیا اور اس کے امی ابّو اس لڑکے سے انتہائی خوش ہو کر بات کر رہے تھے۔۔۔مناہل کی امی نے جب مناہل کو دیکھا تو خوش ہو کر کہا۔

"دیکھو مناہل کون آیا ہے۔۔۔۔ازلان۔"

ازلان مناہل کو دیکھ کر بولا۔۔۔۔۔

"میں تو مناہل کو کل راستے میں بھی ملا تھا۔۔۔البتہ اس نے مجھے پہچانا نہیں۔۔۔" زینب نے مناہل کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔۔۔" یہ تمھاری پھوپو کا بیٹا ہے۔۔ازلان جس کے ساتھ تم بچپن میں سب سے زیادہ کھیلا کرتی تھی۔۔۔۔مناہل بے حد حیران ہوئی کہ یہ تو ازلان ہے اس کی پھوپو کا بیٹا۔۔۔ازلان کے والدین گزر چکے تھے اور وہ کافی وقت سے شہر کے باہر پڑھائی کر رہا تھا، پڑھائی ختم کر کے وہ ابھی ابھی واپس آیا تھا اور اب اپنے والد کے بزنس کو۔آگے بڑھانا چاہتا تھا۔زینب اسے دیکھ کر اتنی خوش تھی جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔۔۔۔

زینب اسے مناہل کے نکاح ٹوٹنے کی بات بتا چکی تھی اور ازلان نے اپنے ماموجان اور مامی سے کچھ مانگا بھی جس کے لیے وہ ایک منٹ میں راضی تھے بس مناہل کی اجازت چاہیے تھی۔۔۔

میں چلتا ہوں ماموں مجھے کافی دیر ہو رہی ہے۔" مناہل بس ٹرے پکڑ کر کھڑی تھی اور حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

"مناہل کھڑی کیا ہو چائے دو ازلان کو۔" مناہل نے جھٹ سے

اثبات میں سر ہلایا اور ازلان کے سامنے چائے پیش کی تو وہ بولا۔۔۔۔

"ارے نہیں مناہل مجھے بہت لیٹ ہو رہا ہے۔۔اگلی دفعہ آؤں گا تو پکّا مامی کے ہاتھ کا کھانا کھا کر ہی جاؤں گا۔۔" زینب نے بہت اصرار کیا پر وہ جلدی میں تھا اس لیے اس نے کچھ کھایا نہیں۔۔۔"چلتا ہوں ماموجان۔۔۔اور میں نے جو کہا ہے اس کے لیے مناہل سے زبردستی نہ کریں۔۔۔چلتا ہوں اللہ حافظ۔۔۔۔اتنا کہہ کر وہ ایک نظر مناہل پر ڈالتا ہے جو ان کی باتوں کو سمجھنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔۔۔اور پھر وہاں سے چلا گیا۔اس کے جاتے ہی زینب خوشی سے پاگل ہو کر مناہل کو گلے لگاتے ہوئے بولی۔۔۔

"آج یقین ہو گیا کی جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے روحیل نے جو کیا اس کے پیچھے اللہ پاک نے تمھارے لیے اتنی بڑی خوشی چھپا کر رکھی تھی مناہل"۔۔۔

وہ کچھ سمجھ نہیں پائی۔۔۔"ازلان نے ہم سے تمہارا ہاتھ مانگا ہے، وہ تم سے نکاح کرنا چاہتا ہے"۔۔۔مناہل دنگ رہ گئی۔۔۔اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔۔۔"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی آپ میرے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہی۔"

"نہیں بیٹی میں تم سے مذاق بھلا کیوں کروں گی"۔۔مناہل چپ ہو گئی۔۔"کیا ہوا بیٹی کیا تم رضامند نہیں ہو"۔۔۔۔۔مناہل کچھ لمحے بعد بولی۔۔"امی اگر ازلان نے بھی روحیل جیسی حرکت کی تو۔۔۔"نہیں میری بچی ازلان ایسا بالکل نہیں ہے۔۔اچھا تم کچھ وقت لے لو سوچ کر جواب دینا تم سے ہم اس بار کوئی زبردستی نہیں کریں گے۔۔" مناہل سوچ میں گم ہو گئی کہ اب کیا کرے۔۔۔دو دن بعد ازلان پھر گھر آیا کیوں کہ جاوید مرزا نے اسے رات کے کھانے پر بلایا تھا۔۔مناہل نہیں جانتی تھی کہ وہ آیا ہوا ہے اور ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے۔۔مناہل میرون رنگ کے سلوار سوٹ میں ملبوس تھی سلیقے سے دوپٹہ لے کر زینب کے پاس گئی۔۔۔"امی یہ اتنے لوازمات کیوں تیار کر رہی ہیں آپ، کوئی مہمان آ رہے ہیں کیا۔"؟ زینب نے اسے سرتاپا دیکھا "ماشاءاللہ میری بچی کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔۔۔جاؤ پانی لے کر ڈرائنگ روم میں جاؤ شاباش۔۔ازلان آیا ہوا ہے۔" وہ اس کا نام سن کر دنگ رہ گئی۔۔۔

"امی میں نہیں جاؤں گی۔" زینب اس کی بات پر غصّے سے بولی۔"میں نے کہا نہ جا کر پانی کے لیے پوچھو۔" اس کے کہنے پر وہ مجبور ہو کر پانی لے کر ڈرائنگ روم میں گئی تو وہ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا سفید رنگ کی شرٹ اور بلو جینز میں وہ بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔۔مناہل کو۔دیکھتے ہی مسکرایا اور کہا۔

"السلام علیکم۔" اس کے سلام کرنے پر وہ چونک گئی کہ اسے سلام کرنا چاہیے تھا نہ کہ ازلان کو۔

"وعلیکم السلام" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی اور پانی کا گلاس سامنے پیش کیا۔

"ارے نہیں مجھے نہیں چاہیے۔۔چاہیے ہو گا تو مانگ لوں گا۔۔۔تم بیٹھو نہ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" مناہل پھر چونک گئی۔۔اسے سمجھ نہیں آیا کہ کیا کرے۔وہ اس صوفے پر نہیں بیٹھی جہاں وہ بیٹھا تھا وہ اس کے قریب والے صوفے پر بیٹھی تو ازلان اپنی مسکراہٹ دبانے لگا۔۔

"مناہل ماموجان نے میرے متعلق تم سے بات تو کی ہی ہو گی نہ؟" مناہل چپ رہی وہ سمجھ گیا کہ زینب اور جاوید نے اس سے وہ بات کہی ہے۔۔۔"میں جانتا ہوں مناہل تم کیا سوچ رہی ہو۔۔تمھیں ڈر ہے نہ کہ کہیں میں بھی روحیل جیسا ہوا تو۔۔" مناہل نے جھٹ سے ازلان کی طرف دیکھا۔"میں ایسا خواب میں بھی نہیں کروں گا مناہل کیونکہ۔۔۔میں تمھیں تب سے پسند کرتا ہوں جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔۔۔" مناہل دنگ ہو کر اسے دیکھنے لگی۔۔۔"بس اب تمھارے جواب کا منتظر ہوں۔۔۔تمھیں اگر ہاں کرنی ہے تو بھی مجھے منظور ہے اور اگر نہ کرنی ہے تو بھی مجھے منظور ہے"

مناہل سکتے میں تھی۔۔تب ہی زینب آئی اور مناہل کو ڈائننگ ٹیبل سجانے کو کہا۔۔اور مناہل کام میں لگ گئی۔۔۔کچھ دنوں بعد مناہل نے اپنے امی ابو کی بات مان کر ازلان کے لیے ہاں کر دی۔۔۔زینب بے حد خوش ہوئی۔اور ازلان کو فون پر یہ خوش خبری دی۔۔۔اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کے نکاح کا دن آ گیا۔۔مناہل اور ازلان ایک دوسرے کے نام ہو گئے، مناہل بھی آج بہت خوش تھی کیونکہ روحیل نے اگر نکاح والے دن دھوکا نہ دیا ہوتا تو اسے ازلان جیسا شوہر نہیں ملتا اور ازلان کو اس کی محبت نہیں ملتی۔□□□

Nilofar Sadiya
Block No 2/11
Classic Genrel Store,
Labour Colony,
Nanded, Waghala-431602 (M.S)
irshad3n.n@gmail.com
Mob: 8855009520

ابو سعدی خالد جاوید

معدے کا درد

یوں تو معدے میں بہت سے امراض سے درد پیدا ہوسکتا ہے مثلاً اس کا کوئی سوء مزاج، اس میں کسی خلط ردی کا جمع ہو جانا، اس میں زخم یا ورم کا ہونا۔ لیکن ہم درد معدہ کی جن قسموں کو یہاں خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہتے ہیں ان کے اسباب یہ ہیں۔

1 معدے میں اتنے زیادہ ریاح پیدا ہو جائیں جو وسعت معدہ سے زیادہ ہوں اور جن کے سبب سے تمدد اور تناؤ پیدا ہو جائے۔ اور معدہ میں درد ہو جائے۔ جیسا کہ اکثر نفاخ غذاؤں مثلاً مسور، لوبیا اور گوبھی وغیرہ کے کھانے سے ہو جاتا ہے۔

2 کوئی ایسی غذا کھالی جائے جو اپنی کیفیت (تیزی وغیرہ) یا کمیت (زیادتی مقدار) کی وجہ سے معدے میں تکلیف پیدا کر دے۔

3 معدہ ضعیف ہونے کی وجہ سے معمولی غذاؤں کو بھی ہضم نہ کر سکتا ہو۔ اس لیے ان سے معدے میں ثقل پیدا ہو جائے۔ نیز ضعف ہضم کی وجہ سے ریاح بھی پیدا ہو جائیں اور درد معدہ بھی لاحق ہو جائے۔

علامات

ڈکاریں، ہچکی، پیٹ اور پسلیوں کے سروں میں تناؤ معلوم ہونا فم معدہ میں قعر معدہ کی طرف غذا کے اُترنے کے بعد بائیں طرف تلی کے قریب درد کا پیدا ہونا اور دبانے سے قراقر کی آواز آنا درد ریحی کی علامتیں ہیں۔

درد معدہ غذائی میں غذا کا زیادہ کھالینا یا کسی تیز غذا کا استعمال شاہد ہوگا۔ درد معدہ ضعفی کی خاص علامت یہ ہے کہ کھانا کھانے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور جب تک مریض کھائی ہوئی غذا کو قے نہیں کر دیتا سکون نہیں ہوتا۔

علاج

ریحی میں محلّل ریاح جوارشیں مثلاً جوارش کمونی، جوارش بسباسہ وغیرہ کھلائیں۔ کندر پودینہ اور زیرہ وغیرہ چبائیں تاکہ ریاح ڈکار کے ذریعہ سے خارج ہو جائیں۔ بھوسی نمک وغیرہ سے پیٹ پر سینک کریں۔ خلوء معدہ کی حالت میں مریض سے ریاضت کرائیں۔ پیٹ پر گرم تیل کی مالش کریں۔

درد معدہ غذائی میں فوراً قے کے ذریعہ تکلیف دہ غذا کو خارج کریں اس کے بعد مقویات معدہ استعمال کریں۔ مریض کو ہدایت کریں کہ کھانا تھوڑا تھوڑا دن میں کئی بار کھائے۔ ایک دم زیادہ مقدار میں نہ کھائے اور اگر غذا اپنی کیفیت سے اذیت پہنچاتی ہو تو اس کو ترک کر دیں اور معدہ کی حالت کے موافق غذائیں کھائیں۔

اگر ضعف معدہ سبب ہو تو معدہ کو تقویت پہنچائیں۔ اگر کسی خلط کا اجتماع ضعف معدہ کا سبب ہو تو اس کا تنقیہ کریں۔ قوت ہضم کی امداد و اعانت کے لیے ہاضم ادویہ کا استعمال کریں۔

منتخب و مجرب نسخے

1 دوا۔ برائے درد سر دریحی

جند بید ستر 500 ملی گرام باریک کرکے پہلے کھلائیں۔ اوپر سے پانی میں قدرے سرکہ شامل کرکے پلائیں۔ بے حد مفید ہے۔

2 یہ دوا ہر درد معدہ کے لیے مفید ہے۔ خصوصاً اس درد معدہ میں جس میں بغیر قے کے سکون نہ ہو۔

کندر، مصطگی رومی، شونیز، نانخواہ، پوست بیرون پستہ، عود خام۔
ساری دوائیں ہم وزن لے کر کوٹ چھان کر شہد آملہ میں ملا کر کھانا کھانے سے پہلے 7 گرام کھلائیں۔

3 حبوب: یہ حبوب درد معدہ سرد ریحی کے لیے مجرّب ہیں۔ نمک سنگ، نمک سیاہ، فلفل دراز، بڑنگ کابلی ہم وزن باریک کرکے آب لیموں میں گھول کریں اور پانچ پانچ سو ملی گرام کی گولیاں بنالیں۔ خوراک تین یا چار گولی۔

4 حبوب: یہ ہر قسم کے درد شکم میں مجرّب ہیں۔ اور بہت مفید ہیں۔
زنجبیل، سہاگہ خام، ہینگ، نمک سنگ جملہ ہم وزن لے کر پوست درخت سہجنہ میں پیس کر بقدر کنار دشتی گولیاں بنائیں۔
خوراک ایک گولی بوقت ضرورت۔

5 سفوف برائے درد شکم: یہ چورن ہر قسم کے درد شکم میں مفید ہے۔ ہاضم ہے اور دافع کرم شکم ہے۔
زیرہ سیاہ مدبر بہ سرکہ 12 گرام۔
نانخواہ، انیسون، تخم کرفس، قرفہ، دارچینی، دانی بیل کلاں ہر ایک 6 گرام۔

قرنفل	3 گرام
زنجبیل	9 گرام
نبات سفید	7 گرام

سفوف بنالیں۔ خوراک 4 گرام سے 6 گرام تک پانی یا عرق بادیان کے ساتھ کھائیں۔

6 حبوب: یہ حبوب بھی درد شکم کے لیے عام طور پر مفید ہے۔
سوءِ ہضم، تخمہ و ہیضہ کے لیے بھی مفید ہیں۔
غنچہ گل مدار، نمک سیاہ ہر ایک 12 گرام۔
زنجبیل 6 گرام، فلفل سیاہ 2 گرام۔
سب کو باریک کرکے آب لیموں میں کھرل کریں اور بقدر نخود گولیاں بنا کر رکھ لیں۔ وقت ضرورت ایک یا دو حب استعمال کریں۔

7 حب: درد معدہ، تحلیل ریاح، تقویت ہضم و تولید اشتہا اور ہیضہ وبائی کے لیے مفید مجرّب ہے۔
غنچہ مدار 50 گرام، فلفل سیاہ، نمک طعام ہر ایک 36 گرام، قرنفل کلاہ دار، نوشادر مصفی ہر ایک 9 گرام، آہک آب نادیدہ 3 گرام، افیون خالص 1½ گرام سب کو ایک یوم آب ادرک میں کھرل کرکے خشک کریں۔ اس کے بعد آب لیموں کاغذی میں کھرل کرکے بقدر نخود گولیاں بنالیں اور کچھ بقدر کنار دشتی تیار کرلیں۔ وقت ضرورت دس سال سے کم عمر کے لڑکوں کو ایک دو عدد چھوٹی گولی اور بڑوں کو بڑی گولی روزانہ استعمال کرائیں۔

8 اکسیر اوجاع
درد شکم اور بہت سے امراض شکم میں مفید ہے۔
ست اجوائن، ست پودینہ، کافور سب ہم وزن لے کر ایک شیشی میں ڈال کر دھوپ میں رکھ دیں۔ سب کا تیل ہوجائے گا۔ وقت ضرورت کسی مناسب عرق میں اس کے چار قطرے استعمال کرائیں۔ بہت مفید ہے۔

نوٹ

درد معدہ کا سبب اکثر سوءِ مزاج سادہ یا مادی ہوتا ہے۔ کثرت ریاح بھی مادی ہی کیفیت ہے۔ مذکورہ دوائیں اسی کیفیت کے اعتبار سے تجویز کی گئی ہیں۔ اگر پیٹ کی تکلیف قرحہ یا کسی دوسرے سبب سے ہو تو اس کا علاج کیا جائے۔
یہ ضرور ہے کہ مذکورہ نسخے پیٹ کی بہت سی دوسری شکایتوں کا بھی ازالہ کرتے ہیں۔ طبیب کی ہوشیاری شرط ہے۔

درد فم معدہ

(وجع الفواد)

یہ ایک مرض ہے جس میں فم معدہ میں درد پیدا ہوتا ہے۔ اس کو وجع الفواد یعنی درد قلب مجازی کہا جاتا ہے۔ چونکہ فم معدہ اور قلب قریب قریب ہی رکھے ہوئے ہیں اس لیے بسا اوقات مریض دونوں میں تمیز نہیں کرسکتے اور فم معدہ کے درد کو دل کا درد سمجھنے لگتے ہیں۔

جالینوس کا قول ہے کہ اگر کوئی عام آدمی اپنے قلب اور فم معدہ میں کوئی شکایت بیان کرے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ فم معدہ مراد لے رہا ہے۔ اس لیے کہ قلب اور فم معدہ میں شریان اعظم کے ذریعہ بہت زیادہ مشارکت ہے۔ جس کی وجہ سے فم معدہ کے امراض سے قلب بہت منفعل ہوجاتا

ہے۔ یہ درد اس قدر شدید ہوتا ہے کہ دورے کے وقت مریض کو سخت غشی لاحق ہوجاتی ہے۔ ہاتھ پیر سرد ہوجاتے ہیں اور بسااوقات مریض مزمن سرعت ہلاک ہوجاتا ہے۔کبھی یہ مرض مزمن صورت بھی اختیار کرلیتا ہے۔

اس کی پیدائش کا سبب یا توفم معدہ کا سوءمزاج گرم سادہ ہوتا ہے یا اس پر خلط صفراوی کا انصاب ہوتا ہے جیسا کہ اکثر بھوک وغیرہ کی حالت میں لاحق ہوجاتا ہے۔بعض اوقات سرد اور غلیظ ریاح کا اجتماع بھی اس کا باعث ہوتا ہے۔

علامات

سادہ حرارت کی صورت میں پیاس، منھ کا خشک ہونا اور دخانی ڈکاریں۔صفراوی میں مذکورہ بالا علامات کے ساتھ منھ کے مزے کا کڑوا ہونا، زبان کا زرد ہونا اور ریحی میں ڈکار کے ذریعے یا نیچے سے ریح کے خارج ہونے کے بعد درد میں سکون ہوجانا، نیز کبھی درد کا شدید اور کبھی ہلکا ہوتے رہنا وغیرہ علامتیں پائی جائیں گی۔

علاج

گرم اقسام میں زرشک کو عرق گلاب وعرق گاؤزبان میں پیس کر چھان لیں اور سکنجبین وشربت لیمو ملا کر پلائیں۔صفراوی میں باسلیق کی فصد کھولیں۔تمر ہندی اور اناردانہ وغیرہ دیں۔صندل سرخ گل سرخ، طباشیر، سماق ہم وزن لے کر لعاب اسبغول اور عرق گلاب بقدر ضرورت میں پیس کر فم معدہ پر لیپ کریں۔

سرد ریحی درد میں گرم جوارشات مثلاً جوارش کمونی، جوارش فلافلی وغیرہ دیں۔نضج مادّہ کے بعد مسہلات حارّہ کے ذریعے سے مادّے کا تنقیہ کریں۔ نمک سلیمانی کھلائیں۔فم معدہ پر عطر گلاب ملیں۔

منتخب ومجرب نسخے

1 تکمید

برائے درد فم معدہ ریحی مجرّب ہے۔

سہاگہ، ہلدی دونوں کو باریک کرکے برگ گھیکوار پر چھڑک کر توے پر گرم کرکے فم معدہ کو سینکیں۔

2 سفوف

یہ سفوف ریحی وجع الفؤاد میں بہت مفید ومجرّب ہے۔

نمک ترب، نمک پودینہ، نمک سنگ ہر ایک 3 گرام۔ جوہر لوبان 700 ملی گرام، خوشہ اذخر 4½ گرام، دانہ ہیل 7 گرام سب کو عرق نانخواہ 36 گرام میں اس قدر کھرل کریں کہ خشک ہوجائے۔ احتیاط سے رکھیں اور وقت ضرورت 400 ملی گرام پانی میں رکھ کر کھلائیں۔

3 دوا

یہ دوا ریحی وجع الفواد کے لیے بہت مفید ہے۔

تھوڑا چونا لے کر پانی میں بھگودیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس کا زلال مریض کو پلائیں۔یعنی جب چونا پانی میں بجھ جائے تو اس کا اوپر کا پانی نتھار کر مریض کو پلائیں۔ اس سے درد میں بہت جلد سکون ہوجاتا ہے۔

4 دوا

یہ دوا فم معدہ کے درد میں عام طور پر مفید ہے۔

ہینگ 125 ملی گرام لے کر منقی ایک عدد میں گولی بنا کر مریض کو کھلائیں۔اس سے بہت جلد آرام ہوجاتا ہے۔

5 نسخہ

فم معدہ کے درد میں یہ نسخہ عام طور پر بے حد مفید اور مجرّب ثابت ہوا ہے۔

شیر شتر 1½ کلوگرام پختہ۔

نمک لاہوری 100 گرام۔

دونوں کو ایک بڑی ہانڈی میں ڈال ک نرم آنچ پر ہلکے ہلکے پکائیں۔آنچ تیز ہوئی تو اُبال کھا جائے گا۔

جب گاڑھے ہوجائے تو زعفران کو پیس کر ڈال دیں اور آگ نیچے سے ہٹالیں، صرف کوئلوں پر ہلکے ہلکے پکائیں۔ جب حلوا بن جائے تو اُتار کر سائے میں سکھالیں اور سفوف بنا کر بوتل میں رکھ لیں۔

خوراک 2 گرام ٹھنڈے پانی کے ساتھ۔

6 اگر فم معدہ کے درد میں غشی کی کیفیت ہوتو مندرجہ ذیل نسخہ استعمال کریں۔

عرق گلاب برف میں ٹھنڈا کرکے منھ پر اور سینے پر چھڑکیں۔ جب ہوش آجائے تو عرق گلاب اور سکنجبین ملا کر پلائیں اور شربت انار عرق بید مشک میں ملا کر پلائیں۔

7 اگر ریحی اور بلغمی کیفیت ہے تو مندرجہ ذیل نسخہ استعمال کریں۔

غاریقون مدبّر 2 گرام، مصطگی رومی ایک گرام باریک پیس لیں اور 25 گرام گلقند میں ملا کر پہلے کھلا دیں۔ پھر صعتر فارسی اور بادیان 6،6 گرام اینسون تین گرام عرق گلاب 100 گرام میں جوش دے کر چھان لیں۔ اس میں شربت دینار 25 ملی لیٹر ملا کر

پلائیں۔ پانی کے بجائے عرق بادیان دیں۔

8 ریح کی صورت میں غنچۂ آک 10 گرام، فلفل سیاہ 12 گرام، نمک 25 گرام، لونگ 6 گرام، جوہر نوشادر 9 گرام، چونہ آب نارسیدہ 3 گرام، افیون 6 گرام۔

ایک ایک دن آب ادرک اور آب لیموں میں کھرل کر کے گولیاں بقدر نخود باندھ لیں۔ ایک گولی صبح ایک شام عرق بادیان یا عرق گلاب کے ساتھ کھلائیں۔

یا

بادیان 5 گرام، انیسون 4 گرام، نانخواہ ایک گرام، اجوائن خراسانی ایک گرام، بادرنجبویہ 6 گرام پانی میں جوش دے کر پلائیں۔

نیز کمونی یا حب تنکار یا حب مبارک یا حب جالینوس کا کھلانا نہایت مفید ہے۔

9 سہاگہ 5 گرام، شنگرف 7 گرام، دار فلفل 5 گرام، عاقر قرحا 5 گرام، جمال گوٹہ مدبر 5 گرام۔ اس کی گولیاں بقدر 125 ملی گرام بنالیں۔ گرم پانی اور چینی ملا کر شربت بنالیں اور یہ گولیاں اس شربت کے ساتھ کھلائیں۔

دردِ شکم معدہ کے لیے مندرجہ ذیل نسخہ بہت جامع ہے۔

10 دانہ منقیٰ تخم نکالا ہوا حسب ضرورت۔

125 ملی گرام فی عدد کے حساب سے عمدہ ہینگ لے کر اچھی طرح پیس لیں۔ دانہ منقیٰ کے برابر گولیاں بنالیں۔

بوقت ضرورت ایک گولی کھلا کر ایک دو گھونٹ گرم پانی پلائیں۔ دورے کے وقت دو دو گھنٹہ کے فاصلے سے اسی طرح دو تین گولیاں کھلا دیں، ورنہ روزانہ ایک گولی نہار منہ کھلاتے رہیں۔ اور

گل سرخ، طباشیر، صندل سفید، سماق ہر ایک 3 گرام، عرق گلاب اور لعاب اسبغول میں گھس کر شکم معدہ پر ضماد کریں۔

معدہ کا ورم گرم اور دبیلۂ معدہ

اگر معدہ کا ورم حسن تدبیر کے باوجود زائل نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ معدہ میں ورم گرم پیدا ہو گیا ہے۔

ورم گرم کی علامات یہ ہیں۔

سخت التہاب، سوزش، پیاس، بخار، چبھن والا درد۔ اگر ان علامتوں کے ساتھ بدن نحیف و لاغر ہو جائے، شدید ٹیس محسوس ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ورم دبیلہ یا خراج بن گیا ہے۔

ان حالات میں درد معدہ کے ساتھ ہاتھ پیروں کا ٹھنڈا ہو جانا ردی علامت سمجھا جاتا ہے۔

علامات انفجار

جب دبیلہ میں انفجار پیدا ہوتا ہے یعنی وہ پھوٹتا ہے تو مریض کو پھریریاں آتی ہیں۔ لرزے کی شکایت ہوتی ہے۔ پیپ اور خون قے یا اسہال کے ذریعہ خارج ہوتا ہے، ورم کم ہو جاتا ہے۔

علاج

جب یہ اندازہ ہو کہ معدہ میں ورم گرم پیدا ہو رہا ہے تو پہلے ردع مادّہ کی کوشش کریں۔ چنانچہ پوست کدو خرفہ اور آرد جو وغیرہ کا معدے پر لیپ کریں۔ غذا میں تکلیف کریں۔ کوئی قوی مسہل یا مقئی دوا ہرگز استعمال نہ کریں۔ البتہ فصد کھول دینی چاہیے۔ غذا میں جو، مونگ، بتھوا اور کدو وغیرہ پر اختصار کریں۔ ادویہ ملینہ میں مغز فلوس خیار شنبر استعمال کرائیں۔ یہ مادّے کے لیے مخرج بھی ہے اور ورم کو بھی تحلیل کرتا ہے۔

اگر مغز املتاس کو آب کاسنی سبز مروّق میں استعمال کرائیں۔ یہ مادّے کے لیے مخرج بھی ہے اور ورم کو بھی تحلیل کرتا ہے۔ اگر مغز املتاس کو آب کاسنی سبز مروّق میں استعمال کرائیں تو اس حالت میں بہت ہی سودمند ہے۔

یہ نسخہ بھی بہت نافع ہے۔

آب عنب الثعلب سبز مروّق، آب کاسنی، سبز مروّق ہر ایک 30 گرام، مغز املتاس 3 گرام بھگو کر مل چھان کر روغن بادام شیریں، روغن کدو ہر ایک 7 گرام شامل کر کے پلائیں شدت درد کے وقت تخم خیار بقدر 10 گرام آب سرد کے ساتھ پھنکانا یا آب طبرزد پلانا بہت نفع مند ہے۔

اگر ورم میں دبیلہ بننے کی علامات نمایاں ہونے لگیں تو فوراً کسی مناسب رگ کی فصد کھولیں اور معدے میں داخلی اور خارج طور پر ٹھنڈک پہنچائیں تاکہ اس کا دبیلہ بننا رُک جائے۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہو اور پکنے لگے تو اس کے منتظر رہیں کہ وہ پھوٹے۔ اگر خود سے نہ پھوٹے تو اس غرض کے لیے تازہ دودھ گرم پانی کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے پلائیں اور ورم کو نرمی کے ساتھ دبائیں تاکہ وہ پھوٹ جائے۔ اس کے بعد مریض کو ماء السکر یا ماء العسل پلائیں تاکہ پیپ صاف ہو جائے، پھر ادویہ ملتحمہ و مدملہ جیسے کندر، دم اخوین، کہربا شمعی گل ارمنی اور گل سرخ وغیرہ استعمال کرائیں۔

(بحوالہ: درد علامت اور علاج، ابو سعدی خالد جاوید، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، سنہ اشاعت 2002)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

ترتیب و تدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

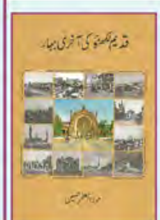

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

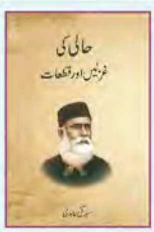

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जून- २०२४ वर्ष: ८, अंक: ६
Mahnama Khawateen Duniya Monthly June 2024 ,Vol. 8, Issue: 6
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-06-2024
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025